تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا
مذہبی اور علمی تحقیقی رسالہ
ماہنامہ
الفرقان
ربوہ
پاکستان
نومبر ۱۹۵۷ء
"اے بندگانِ خدا! یقین رکھو کہ قرآن شریف میں غیر محدود معارف و حقائق کا اعجاز ایسا کامل اعجاز ہے جس نے ہر ایک زمانہ میں تلوار سے زیادہ کام کیا ہے اور ہر ایک زمانہ اپنی نئی حالت کے ساتھ جو کچھ شبہات پیش کرتا ہے یا جس قسم کے اعلیٰ معارف کا دعویٰ کرتا ہے اس کی پوری مدافعت اور پورا الزام اور پورا مقابلہ قرآن میں موجود ہے۔" (ازالہ اوہام)
ادارۂ تحریر
ایڈیٹر: ابوالعطاء جالندھری
سالانہ قیمت پیشگی
پاکستان: پانچ روپے
بیرونی ممالک: سات روپے یا بارہ شلنگ

تبصرہ

"اسلام پر ایک نظر"

(از جناب مولانا عبد المجید صاحب سالک لاہور)

مستشرقین مغرب نے اسلام پر بے اندازہ لٹریچر مہیا کیا ہے جس میں اکثر تعصب یا جہالت کی وجہ سے ناقص اور مضر ہے۔ اور ہمارے مبلغین نے اس پر اکثر اعتراضات کئے ہیں۔ اس حالت میں اگر کسی مستشرق کی ایسی تحریر نظروں سے گزرتی ہے جو صحیح الخیالی اور صحیح النظری کی مظہر ہو تو بے انتہا مسرت ہوتی ہے۔ اطالیہ کی مشہور فاضلہ خاتون پروفیسر ڈاکٹر وگلیری کی کتاب "تعبیر اسلام" اگرچہ مختصر ہے لیکن اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاتون کو علمی بالغ نظری کے علاوہ قبول حق کے لئے ایک سعید روح ودیعت ہوئی ہے۔ موصوفہ نے اسلام کی ابتداء۔ اس کے عقائد۔ اس کی اشاعت۔ اس کی فتوحات۔ اس کی تعلیمات کی ترقی اور تنزل کے متعلق جن معلومات و خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ آجکل کے پڑھے لکھے مسلمانوں کے خیالات سے ہرگز مختلف نہیں۔

اسلام پر بعض مخالفین کے اعتراضات کا جواب خاتون موصوفہ نے نہایت قطعیت اور معقولیت سے دیا ہے اور اپنی تمام تر تحقیق سے یہ نتیجہ مرتب کیا ہے کہ آجکل کے مسلمانوں میں جو کمزوریاں اور جہالتیں پائی جاتی ہیں ان کے وہ خود ذمہ دار ہیں۔ اسلام اور اس کی تعلیمات کا اس میں کوئی قصور نہیں مسلمان جب کبھی قرآن حکیم سے کسب فیض کریں گے۔ وہ اسے ایسا ہی مکمل اور فیض رساں پائیں گے۔ جیسا وہ ہمیشہ سے چلا آیا ہے۔

شیخ محمد احمد صاحب مظہر (ایڈووکیٹ لائلپور) کا علمی و اسلامی ذوق قابل تحسین ہے کہ انہوں نے ڈاکٹر وگلیری کی اس کتاب کا اردو میں ترجمہ بے حد احتیاط و اہتمام سے کیا۔ چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب کا لکھا ہوا ایک دیباچہ بھی شامل ہے۔ میرے نزدیک ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے جو باعث ازدیاد ایمان ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کی مؤلف اور مترجم اور ناشر سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

عبد المجید سالک

مسلم ٹاؤن لاہور
۲۰ر اکتوبر سنہ ۵۷ء

ملنے کا پتہ:- مکتبہ الفرقان ربوہ - قیمت دس آنے صرف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الفرقان

نومبر ۱۹۵۷ء

فہرست مندرجات

(طابع وناشر ابوالعطاء جالندھری نے ضیاء الاسلام پریس ربوہ میں چھپوا کر دفتر الفرقان ربوہ ضلع جھنگ سے شائع کیا)

اصحاب اس پر غور کر سکتے۔

لیکن جہاں یہ ذمہ داری قادیانی جماعت کے سربراہوں کے سر عائد ہوتی ہے وہیں علما امت پر بھی یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس گروہ کے عقائد کی اصلاح کے لئے مساعی کریں۔ پچھلے ستر سال میں ہمیں ایک بھی ایسی کوشش نظر نہیں آتی جس میں علمار نے مناظرے اور مجادلے کے علاوہ تبلیغ و دعوت کے ذریعہ انہیں گمراہی سے موڑنے کی کوشش کی ہو۔ زیادہ سے زیادہ اگر یہ کچھ ہو سکا ہے تو یہ کہ امتِ مسلمہ کو اس خطرے سے پوری طرح متنبہ کر دیا گیا۔ یقیناً یہ بھی ایک بڑا کام ہے اور اس کا اتنا نتیجہ بھی ظاہر ہے کہ یہ گروہ امت سے کٹ کر ایک علیحدہ فرقہ بن گیا مگر اس سے کچھ آگے بھی کام کیا جا سکنا ممکن تھا۔ خوارج ہی کے سلسلہ میں دیکھیے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ علمار کی ترغیب و دعوت سے ہزاروں خوارج اپنے غلط عقیدوں سے توبہ کر کے سوادِ اعظم سے مل گئے۔ یہی کچھ آج بھی ممکن ہے بشرطیکہ کچھ ایجابی اور اقدامی کام کئے جائیں۔ (دعوت دہلی)

(صدق جدید ۳۰ اگست ۵۷ء)

محترم ایڈیٹر صاحب کو جماعت احمدیہ کی مساعی سے اتفاق ہے۔ ان کی اشاعت اسلام اور اشاعت قرآن سے اتفاق ہے بلکہ ان کے اصولی عقائد سے بھی اتفاق ہے۔ کیونکہ "توحید، رسالت اور آخرت کی قدریں" یکساں ہیں۔ لیکن بایں ہمہ وہ لکھتے ہیں:۔

> "یہ اجمال جب تفصیل میں بدلتا ہے تو وہ عظیم فرق نمایاں ہو جاتا ہے کہ سمت سفر ہی بدل جاتا ہے۔ اور حدود ایمان کی بجائے کفر کی شروع ہو جاتی ہیں۔ اور یہ بات ابھی نہیں اس سے پہلے خوارج کا معاملہ بھی یہی تھا۔ بنیادی اقدار پر یقین کے باوجود تعبیرات اور تفصیلات نے انہیں دائرہ اسلام ہی سے خارج کر دیا تھا۔ کاش قادیانی جماعت کے ذمہ دار اصحاب اس پر غور کر سکتے۔"

ان الفاظ میں جو ابہام ہے اسے واضح کرنا ضروری تھا۔ اے کاش کہ مدیر "دعوت" یہ بھی ذکر کر دیتے کہ "توحید، رسالت اور آخرت" میں اجمالی اتحاد کے بعد تفصیل میں کیا اختلاف پیدا ہوتا ہے اور کیسے اور کہاں پیدا ہوتا ہے؟ ہم نے تو جہاں تک غور کیا ہے اور بارہا اس پر غور کیا ہے

ہمیں تو صاف نظر آتا ہے کہ اس بارے میں ہمارے ان خیر خواہ اصحاب کو ہمارے عقائد کے بارے میں کوئی غلط فہمی ہے ورنہ جو تفصیل جماعت احمدیہ پیش کرتی ہے وہ قرآن مجید کے مطابق اور پوری معقولیت پر مبنی ہے۔

توحید کے بارے میں ہمارا تفصیلی عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات اپنی صفات اپنے افعال اور اپنی عبادت کے لحاظ سے واحد و یگانہ ہے۔ کسی رنگ میں شرک کو ہم جائز نہیں سمجھتے۔ ہم اللہ تعالیٰ کو الحی القیوم یقین کرتے ہیں۔ اس کی تمام صفات کو قائم اور مستقل مانتے ہیں کسی صفت میں تعطل یا معدومیت کے قائل نہیں۔ اسی بناء پر ہم یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جس طرح پہلے زمانوں میں اپنے پیارے بندوں سے مکالمہ فرماتا تھا اور ان پر اپنی مرضی کا اظہار فرماتا تھا اب بھی ایسا کرتا ہے اور آئندہ بھی ایسا کرتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ کی صفتِ کلام کا دوام اس کی ہستی اور توحید کا ثبوت ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے بچھڑے کے بارے میں فرمایا۔

اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ (اعراف: ۱۴۸)

کیا وہ اتنا غور نہ کرتے تھے کہ وہ بچھڑا تو نہ ان سے کلام کرتا تھا اور نہ انہیں کسی راستہ کی راہنمائی کرتا تھا پھر اسے انہوں نے معبود کیوں بنا لیا؟

جہاں تک توحید باری تعالیٰ کے عقیدہ کی تفصیل کا سوال ہے ہم یہ بھی ماننے کے لئے تیار نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ایسا زندہ وجود بھی ہو سکتا ہے جو کھانے پینے کے بغیر ایک ہی حالت پر قائم رہے اور تغیر و زوال کا شکار نہ بنے۔ اسی بناء پر جماعت احمدیہ اس عقیدہ کو توحید کی کامل تفصیل کے منافی سمجھتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام انیس سو سال سے آسمانوں پر جسم خاکی کے ساتھ زندہ ہیں اور الآن کما کان کے مصداق ہیں۔

ظاہر ہے کہ ہمارے مخالف یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جسمانی زندگی کا اعتقاد نہیں رکھتے مگر وہ یہ کہنے کا حق نہیں رکھتے کہ ہم توحید کی تفصیل میں اسلام کے دائرہ سے باہر ہیں۔ اسلام کا دائرہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے جس کی تشریح سرور کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے۔ اس دائرہ کی اولین شرط یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کامل توحید پر ایمان لایا جائے۔ اور اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اجمال اور تفصیل ہر لحاظ سے احمدی جماعت کامل توحید پر قائم ہے۔ ہاں اسلام کا اگر کوئی اور دائرہ بعض علماء اور مشائخ نے مقرر کر رکھا ہے تو ہماری اس سے کوئی بحث نہیں ہے۔

رسالت کے بارے میں بھی ہمارا اجمالی اور تفصیلی عقیدہ نہایت واضح اور روشن ہے۔ ہم اعتقاد رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابتداء سے

انبیاء مبعوث فرمائے ہیں اور ہر قوم میں اس کے
فرستادے آتے رہے ہیں۔ ان انبیاء میں بعض
نئی شریعت لائے تھے جس سے سابقہ شریعت
منسوخ قرار پاتی تھی اور بعض سابقہ شریعت کی
تعلیم اور اس کے اجراء کے لئے مبعوث ہوتے
تھے وہ اپنی نئی شریعت نہ لاتے تھے۔ ہمارا عقیدہ
ہے کہ نئی شریعت لانے والے انبیاء آئندہ
نہیں آئیں گے کیونکہ قرآنی شریعت کامل ترین شریعت
ہے۔ وہ سارے زمانوں کے لئے ہے اور سب
انسانوں اور قوموں کے لئے ہے۔ اور وہ ہمیشہ
کے لئے ہر طرح سے **محفوظ** ہے اسلئے صاحب
شریعت نبی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارا
عقیدہ ہے کہ ہمارے نبی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ
علیہ وسلم سب نبیوں کے سردار اور سب سے اعلیٰ و
افضل ہیں۔ آپ **خیر الانبیاء** اور **خاتم المرسلین**
ہیں اور آپ کی امت **خیر اُمّۃ** ہے اسلئے
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ قدسیہ کی
تاثیرات سے آپ کی امت میں وہ تمام انعامات
جاری ہیں جو پہلی امتوں کو ملتے رہے ہیں یعنی آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں صالح، شہید، صدیق
اور نبی بن سکتے ہیں۔ جیسا کہ آیت قرآنی وَمَنْ
يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ
الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ
النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ
وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ
رَفِيْقًا (نساء ع ۹) کا واضح مفاد ہے۔

ہم رسالت کے بارے میں اس کے علاوہ یہ
بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ جملہ انبیاء علیہم السلام
معصوم تھے اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم
سید المعصومین تھے۔ ہم ان تمام قصوں کو جو
نبیوں کی شانِ عصمت کے مخالف ہیں کذب و
دروغ یقین کرتے ہیں خواہ ان قصوں کو مفسرین
نے تفسیر قرآن کے نام سے اپنی تفاسیر میں درج
کیا ہو۔ ہمارے نزدیک **عصمتِ انبیاء** کا عقیدہ
ایک بنیادی عقیدہ ہے۔

جہاں تک آخرت پر ایمان کا سوال ہے
ہم **الیوم الآخر** پر اعتقاد رکھتے ہیں۔
اور اسے ان تمام تفصیلات اور تعبیرات کے
ساتھ مانتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے
بیان فرمائی ہیں۔ ان سے سرمو انحراف کو کفر و فسق
یقین کرتے ہیں۔ ہم جنت و دوزخ اور جزا و سزا پر
اسی طرح ایمان رکھتے ہیں جس طرح ایمان رکھنے کا
تقاضا اسلام کرتا ہے۔

اندریں حالات ہم یہ سمجھنے سے معذور ہیں کہ
"توحید، رسالت اور آخرت" کے بارے میں ہماری وہ
کونسی تفصیل ہے جسے مدیر "دعوت" دائرہ اسلام سے
خروج قرار دے سکتے ہیں؟ محترم مدیر صاحب نے
علماء کو اس بارے میں زیرِ الزام قرار دیا ہے کہ انہوں
نے گزشتہ ستر سال میں احمدیوں کو "گمراہی سے موڑنے"
کی کوئی کوشش نہیں کی محض مناظرے رچا دیے

کرتے رہے ہیں۔ مگر تعجب ہے کہ آپ نے خود بھی اس شذرہ میں اسی روش کو اختیار فرمایا ہے۔ ورنہ بتایا جائے کہ احمدیہ عقائد کی وہ کونسی تفصیل ہے جسے آپ "گمراہی" سے موسوم کر سکتے ہیں؟ یونہی اپنے خیال کے خلاف بات سن کر اُسے گمراہی سے تعبیر کر دینا تو علماء کا پُرانا وطیرہ ہے جس کے خلاف آپ خود احتجاج کر رہے ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ علماء نے کوئی مثبت کوشش تو نہیں کی مگر ان کے مجادلات نے اتنا فائدہ ضرور پہنچایا کہ "اُمتِ مُسلمہ کو اس خطرے سے پوری طرح متنبہ کر دیا گیا"۔ یعنی عوام کو احمدیوں کی طرف اُن کے غیر مسلّمہ عقائد منسوب کر کے نفرت دلا دی گئی۔ اور اُن کے قلیل التعداد اور ضعیف ہونے سے یہ ناجائز فائدہ حاصل کیا گیا۔ کہ انہیں "خطرہ" قرار دیکر بہتّر فرقوں کو ایک طرف کر دیا گیا اور جماعتِ احمدیہ سب سے الگ تہترّ واں فرقہ قرار پا گئی۔

اہلِ فکر سے ہماری درخواست ہے۔ کہ وہ اس صورتِ حال پر خدا ترسی سے غور فرما دیں کہ کیا اِسے علماء کی کامیابی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟ پھر کیا یہ صورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث وستفترق اُمّتی علیٰ ثلاث وسبعین ملّة کلّھم فی النّار الّا ملّة واحدة (کہ میری اُمت کے تہتر فرقے ہو جائیں گے وہ سب ناری ہونگے سوائے ایک فرقہ کے جو ناجی ہوگا) کے مطابق جماعت احمدیہ کو حق پر ثابت نہیں کرتی؟

محترم مدیر "دعوت" ہمیں خوارج قرار دیتے ہیں مگر انہوں نے اتنا غور نہیں فرمایا۔ کہ خوارج تو پوری خلافتِ راشدہ کے قائل نہیں مگر جماعت احمدیہ تو چاروں خلفائے راشدین کو برحق خلیفے مانتی ہے۔ ہم تو جملہ ایمانیات پر ایمان رکھتے ہیں اور سب انبیاء کی نبوّت کے قائل ہیں۔ خلفاء کی خلافت کو مانتے ہیں۔ سب ائمہ، صلحاء اور اولیاء کو برحق یقین کرتے ہیں۔ ہمیں خوارج قرار دینا سراسر بے انصافی ہے۔

پھر کیا ہم یہ عرض کرنے میں غلطی پر ہیں کہ خدارا اس سلوک اور توفیق کو دیکھو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جماعت احمدیہ کے شاملِ حال ہے کس طرح اللہ تعالیٰ انہیں اس زمانہ میں چاردانگ عالم میں اسلام کی اشاعت کی توفیق عطا فرما رہا ہے۔ کس طرح انہیں قرآن مجید کے دُنیا کے گوشے گوشے میں پہنچانے کی توفیق بخش رہا ہے۔ کیا کبھی خوارج یا چھوڑ اہلِ سنّت کہلانے والوں کو بھی یہ توفیق ملی ہے؟ ہرگز نہیں۔

پس دردمندانہ التجا ہے کہ خدا کے مسیح کی جماعت کو جو اسلام کی اشاعت کا بیڑہ اٹھائے ہوئے ہے خوارج کہہ کر غلط طور پر تسلی حاصل نہ کریں بلکہ اللہ تعالیٰ کی اس تائید و

نصرت کو دیکھیں جو اس جماعت کے شاملِ حال ہے۔ کبھی کڑوے درخت کو شیریں پھل نہیں لگ سکتے۔ یہ شیریں اثمار اِس امر کی کھلی دلیل ہیں کہ یہ درخت شجرۂ طیبہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہی اسے آخری زمانہ میں قائم کیا ہے۔ اب یہ پودا بڑھے گا اور پھیلے گا اور پھلے گا۔ یہی آسمانی نوشتہ ہے، یہی خدا کی تقدیر ہے اسلئے وہ لوگ خوش بخت ہیں جنہیں اِس زمانہ میں اسلام کی خدمت کی توفیق مل رہی ہے اور جو اسلام کے پرچم کو بلند کر رہے ہیں۔ کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ آپ حضرات اِس کارِ خیر میں حصّہ لیں؟ اللہ تعالیٰ سب کو توفیق بخشے۔ آمین یا ربّ العالمین ٭

غیر مسلموں سے اشتراکِ عمل

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی اپنی "سچی باتوں" میں "غلط معیار" کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں:۔

"ایک عجیب سی بحث پنجاب (پاکستان) کے بعض دینی اخبارات میں چھڑی ہوئی ہے۔ ایک مرحوم حنفی المذہب مولانا کا (جو اپنی مذہبیت سے کہیں زیادہ اپنی "احراریت" کے لئے مشہور تھے) ایک طویل مکتوب ان کے انتقال سے عرصہ کے بعد اب شائع ہوا ہے کہ گمراہ تحریکوں کے لیڈروں (سر سیدؒ، مرزا غلام احمد قادیانی اور عنایت اللہ مشرقی) نے انگریزوں ہی کی حمایت کی۔ اور جو لوگ اپنے قدیم مسلکوں سے ٹوٹ کر ان میں شریک ہوئے وہ عموماً اہلحدیث ہی تھے۔ اس قدر۔ طبقہ اہلحدیث کی طرف سے جوابات نکل رہے ہیں کہ یہ غلط الزام ہم پر کیسا؟ ہم تو انگریزوں کے آزادی حاصل کرنے کی تحریک میں سب سے پیش پیش رہے ہیں۔ اور رہے یہ باطل کے فرقے! ان میں تو نمایاں آپ ہی کے فرقے کے لوگ رہے ہیں (فلاں اور فلاں)

لیکن واقعاتی جوابات سے قطع نظر اصل سوال یہ ہے کہ خود حقانیت ہی کا معیار انگریز دشمنی کب سے قرار پایا ہے؟ اسلام کی بنیاد تو اللہ کی توحید، اس کی عظمت و محبت پر ہے نہ کہ ابلیس کی دشمنی پر۔ اور جب دشمنی خاص ابلیس سے نہیں بلکہ فلاں اور فلاں شیطان زدہ قوم سے ہو! سیاسیات میں اجتہادی یعنی نقطۂ نظر کے اختلافات ہمیشہ رہے اور ہمیشہ چلیں گے۔ اخلاص کے ساتھ جنہوں نے غیر مسلموں کے ساتھ اشتراکِ عمل کو جائز بلکہ ضروری سمجھا انہیں بھی انشاء اللہ وہی اجر ملیگا جو انہیں ملیگا جنہوں نے اخلاص کے ساتھ اشتراکِ عمل کو حرام قرار دیا"۔ (صدق جدید ۲۰ ستمبر ۱۹۵۷ء)

الفرقان۔ ہمارے نزدیک مولانا دریابادی کا یہ تجزیہ نہایت اگرچہ نہایت مختصر ہے مگر معقول اور درست ہے۔ ایسے امور میں اشتراکِ اعمال بالکل جائز اور ضروری ہے ٭

قرآن مجید کی تاریخی حیثیت پر پروفیسر فلپ حِتّی کے اعتراض کا جواب

۱۔ حضرت مریم کو اُختِ ہارون کیوں کہا گیا؟ ۲۔ ہامان کون تھا؟

(جناب شیخ عبدالقادر صاحب لائلپوری)

پروفیسر فلپ حِتّی زمانۂ حاضرہ کے مشہور مؤرخ اور مستشرق ہیں۔ اُن کی کتاب "ہسٹری آف دی عربز" (مختصر اور مفصّل ہر دو ایڈیشن) مجموعی حیثیت سے نسبتاً ایک فراخدل اور وسیع النظر مؤرخ کا شاہکار ہے۔ صاحبِ موصوف نے جدید اسلوب کے ساتھ مسلمانوں کی تاریخ کا جائزہ پیش کیا ہے۔ لیکن آپ نے ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھولی جہاں چاروں طرف اسلام اور بانیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر یورش پورے زوروں پر تھی۔ مسیحی پادریوں اور مستشرقین نے اسلام اور مسلمانوں کی تصویر کے تاریخی خدوخال اِس درجہ مسخ کر رکھے تھے کہ اصل حقیقت کا پہچاننا مشکل تھا۔ ماحول کے اِن اثرات میں سے کچھ نہ کچھ اثر قبول کرنا فطری بات تھی۔ آپ نے بھی یہ اثرات قبول کئے یہاں تک کہ بعض مسائل میں صاحبِ موصوف کے خیالات بالکل مسیحی پادریوں کا چربہ معلوم ہوتے ہیں۔ اِس سلسلہ میں مجھے جو بات سب سے زیادہ کھٹکی ہے وہ یہ ہے کہ پروفیسر فلپ حِتّی اسلام کی بنیادی اقدار میں سے مسئلہ توحید کو سمجھنے میں سراسر ناکام رہے ہیں۔ ان کی تحقیق کا نتیجہ جو کہ ایک محتاط مؤرخ کی طرح انہوں نے خود نہیں نکالا بلکہ قارئین پر چھوڑ دیا ہے، یہ ہے کہ اللہ دراصل قریش کا قبائلی دیوتا تھا۔ عرب میں وہ اکیلا دیوتا نہ تھا۔ اس کے ساتھ دوسرے دیوتا بھی شریکِ عبادت تھے۔ شرک کا مفہوم صرف یہ ہے کہ اِس بڑے دیوتا کے ساتھ دوسرے دیوتاؤں کی پوجا نہ کی جائے۔ اِسی طرح اَلرَّحْمٰن اور اَلرَّحِیْم کے متعلق یہ تحقیق پیش کی گئی کہ یہ بھی دراصل جنوبی عرب کے دو قدیم ترین دیوتا تھے۔ پروفیسر فلپ حِتّی کی تحقیق میں اسلامی الٰہیات کی بنیاد اللہ جیسے بڑے دیوتا کی ذات میں مختلف دیوتاؤں کو مجتمع کر دینے میں ہے۔

پروفیسر فلپ حِتّی نے اِس عجیب و غریب نظریہ کی تائید میں شام و عرب کے آثارِ قدیمہ کی شہادتیں پیش کی ہیں۔ چونکہ یہ کتاب ایم۔ اے کے کورس میں شامل ہے بعض پڑھے لکھے نوجوان پروفیسر حِتّی کے نظریات سے بُری طرح متاثر نظر آئے اسلئے اِن کے جوابات ضروری تھے۔ چنانچہ ماہنامہ "الفرقان" ماہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۵۴ء کی اشاعت میں دو تحقیقی مضمون مذکورہ نظریہ کے رد میں پیش

کئے جا چکے ہیں۔

اب قرآن مجید کی تاریخی حیثیت کے متعلق پروفیسر حتّی کے بعض اعتراض قابلِ جواب سمجھتا ہوں۔ پروفیسر صاحب اپنی کتاب کے باب نہم میں قرآن مجید کا مختصر تعارف پیش کرتے ہیں۔ اس تعارف میں جہاں آپ کو پھول ملیں گے وہاں ایک دو کانٹوں کی چبھن بھی آپ محسوس کریں گے۔ ایک فقرہ ملاحظہ ہو:-

"حسبِ قرآن عیسیٰؑ کی ماں مریم عمران کی بیٹی اور ہارون کی بہن بھی ہوتی ہیں۔ اور اسی طرح ہامان جو فارسی بادشاہ اخسویرس کا منظورِ نظر تھا۔ قرآن میں اسی کو فرعون کا وزیر بتایا گیا ہے۔"

پروفیسر فلپ حتّی نے اس فقرہ میں ایسے طریق پر قرآن مجید کی تاریخی حیثیت پر اعتراض کیا ہے کہ پڑھنے والے کو شاید اس طنز کی چبھن پورے طور پر محسوس نہ ہوتی ہو۔ پروفیسر حتّی کے اعتراض کی تفصیل یہ ہے کہ مریم اُختِ ہارون اور تھیں اور مریم والدہ حضرت مسیح ناصریؑ اور ہیں۔ عمران کی بیٹی اور حضرت ہارونؑ کی بہن مریم حضرت مسیح ناصریؑ کی والدہ سے تیرہ سو برس پہلے ہوتی ہیں۔ قرآن ان کو ایک قرار دے رہا ہے۔ اسی طرح ہامان فرعون کا ہم عصر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہامان فرعونِ موسیٰؑ سے آٹھ سو برس بعد کی ایک شخصیت کا نام ہے۔

میں حیران ہوں کہ اس سوال کے جواب میں پروفیسر حتّی جیسے فاضل انسان کے متعلق کیا رائے قائم کروں۔ کیا اُن کو علم نہیں کہ قرآن مجید نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ سے لے کر حضرت مسیح ناصری علیہ السلام تک ایک لمبے عرصے کا جابجا ذکر کیا ہے جس میں بہت سے انبیاءِ بنی اسرائیل مبعوث ہوئے۔ جب قرآن مجید حضرت ہارونؑ اور حضرت مسیح ناصریؑ کے درمیان ایک لمبے زمانے کے گزرنے کا ذکر کرتا ہے تو پھر کتنی زیادتی ہے کہ اسی کتاب کے متعلق یہ کہا جائے کہ اُسے اتنا بھی علم نہیں کہ مریم اُختِ ہارون اور تھیں اور مریم والدہ یسوع ناصریؑ اور۔ﻪ

بات دراصل یہ ہے کہ "اُختِ ہارون" اور "بنتِ عمران" کے خطاب میں قرآن مجید نے بعض خاندانی اور ذاتی مناسبتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو کہ حضرت ہارونؑ اور حضرت مریمؑ کے مابین پائی جاتی ہیں۔

بنتِ عمران

قرآن مجید کے نزدیک حضرت ہارونؑ اور والدہ

ﻪ سیل نے اپنے ترجمۂ قرآن میں تسلیم کیا ہے کہ جب بقولِ قرآن حضرت موسیٰؑ اور حضرت مسیح ناصریؑ میں ایک لمبا زمانہ گزرا ہے تو پھر یہ اعتراض بے معنی ہے۔ ([illegible])

ﻪ حتّی نے یہ اعتراض "لیگیسی آف اسرائیل" کے ایک مضمون سے لیا ہے۔ دوسری جگہ حاشیہ میں اس کتاب کا ذکر موجود ہے۔ اسی کتاب میں یہ اعتراض ذیل کے الفاظ میں بیان ہوا ہے:-
"قرآن یہاں تک ایک غیر معمولی بودی بات بیان کرتا ہے کہ اس نے مریم اُختِ ہارون اور مریم والدہ یسوع ناصری کو ایک ہی سمجھ لیا ہے۔" (نعوذ باللہ) ملاحظہ ہو
(The Legacy of Israel P.34)

یسوع ناصریؑ دونوں خاندانِ عمران سے تعلق رکھتے تھے۔
سورۂ آلِ عمران میں خاندانِ عمران کی فضیلت کے ذکر کے بعد حضرت مریمؑ کی والدہ کا ذکر ہے۔ انہیں "اِمْرَاَۃُ عِمْرَانَ" یعنی "خاندانِ عمران کی ایک عورت" کے الفاظ سے یاد کیا گیا۔ سورۂ تحریم کے آخر میں حضرت مریمؑ کو "بِنْتَ عِمْرَانَ" کہا گیا۔ اور سورۂ مریم میں "اُخْتَ ھَارُوْنَ"

بروئے تورات عمرام حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ اور اُن کی بہن مریم کے والد کا نام ہے۔ (گنتی ۲۶/۵۹) ان کے خاندان کو عمرام کا گھرانا یعنی آلِ عمرام کہا گیا۔ (گنتی ۳/۲۷)

قرآن مجید کی رُو سے چونکہ حضرت مریمؑ عمران یا عمرام خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اسلئے ان کو بِنْتِ عمران اور ان کی والدہ کو "اِمْرَاَۃُ عِمْرَانَ" کہا گیا۔

انجیل میں حضرت مریمؑ کی ایک قریبی رشتہ دار ذکریا کاہن کی بیوی الیصبات کو "یکے از بناتِ ہارون" کہا گیا ہے (لوقا ۱/۵) اسی طرح حضرت مسیح ناصریؑ کو ابنِ آدم، ابنِ ابراہیم اور ابنِ داؤد کے خطابات دیئے گئے ہیں۔ اگر الیصبات ہارونؑ کی نسل میں ہونے کی وجہ سے بنتِ ہارون کہلا سکتی ہے، اور اسی طرح اگر حضرت مسیح ناصریؑ کو مذکورہ بالا خطابات دیئے جا سکتے ہیں تو حضرت مریمؑ عمران کی نسل میں سے ہوتے ہوئے بنتِ عمران کیوں نہیں کہلا سکتیں؟

اخت ہارون

اسی طرح اُختِ ہارون کے خطاب میں کئی ایک مناسبتیں پیشِ نظر ہیں:-

اوّل:- حضرت ہارونؑ اور والدہ یسوع ناصریؑ دونوں عمران کی نسل میں سے تھے۔

دوم:- حضرت ہارونؑ کی حقیقی بہن کا نام مریمؑ تھا۔ یہ اُختِ ہارون ایک بزرگ عورت تھیں اور مُلہمہ ہونے کی وجہ سے نبیہ کہلائیں (خروج ۱۵/۲۰) والدہ یسوع ناصری کا نام انہی کے نام پر مریمؑ رکھا گیا۔

سوم:- حضرت مریمؑ حضرت ہارونؑ کی طرح خاندانِ کہانت (لیوی) سے تعلق رکھتی تھیں۔ اور ہیکل کے لئے مخصوص تھیں۔

اِن مناسبتوں کے پائے جانے کی وجہ سے بروئے قرآن یہود نے اُختِ ہارون کے الفاظ سے حضرت مریمؑ کو خطاب کیا۔ یہ خطاب مذکورہ مناسبتوں کا آئینہ دار تھا۔ لیکن اس میں ایک گہری طنز چھپی ہوئی تھی۔ یہود کا مقصد یہ تھا کہ حضرت ہارونؑ کی بہن مریمؑ تو ایسی نہ تھی۔ اس عالی خاندان میں سے ہوتے ہوئے اور مریم نام رکھنے کے باوجود تجھ سے یہ کیا سرزد ہوا۔ تیرے والدین تو ایسے نہ تھے۔ یہود کا قول بایں الفاظ وارد ہوا:-

یَا اُخْتَ ھَارُوْنَ مَا کَانَ اَبُوْکِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا کَانَتْ اُمُّکِ بَغِیًّا ۝ (سورۂ مریم)

یہاں یہ بات مدِنظر رہے کہ قرآن مجید نے حضرت مریمؑ کی والدہ کو "اِمْرَاَۃُ عِمْرَانَ"، حضرت مریمؑ کو "بِنْتَ عِمْرَانَ" اور یہودیوں کے خطاب "اُخْتِ

ھارون" کو درج کر کے صاف اشارہ کیا ہے کہ مریمؑ اور ابنِ مریمؑ آلِ عمران میں سے تھے۔ اور اس طرح انجیل کی اس تاریخی غلطی کو بے نقاب کیا ہے کہ حضرت مسیح ناصریؑ داؤد کی نسل میں سے ہونے کی وجہ سے ابنِ داؤد ہیں۔ کیونکہ نسلِ داؤد اور آلِ عمران دو مختلف نسلیں ہیں۔ حضرت مسیح ناصریؑ نسلاً تبھی ابنِ داؤد ہو سکتے ہیں جب حضرت مریم داؤد کی نسل سے ہوں۔ انجیل میں حضرت مسیح ناصریؑ کا نسب نامہ یوسف نجار کی طرف سے دیا گیا ہے جو کہ داؤد کی نسل میں سے تھے۔ مریم کا نسب نامہ درج نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ یوسف نجار کی ذریت و نسل حضرت مسیح ناصریؑ نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ وہ بن باپ پیدا ہوئے تھے۔ اسی مجبوری کے پیشِ نظر بعد کے عیسائیوں نے حضرت مریمؑ کو بھی داؤد کی نسل سے غلط طور پر منسوب کر دیا۔ قرآن مجید نے اس تاریخی غلطی کا ازالہ کیا اور بتایا کہ مریمؑ اور ابنِ مریمؑ آلِ عمران میں سے تھے۔ نہ کہ نسلِ داؤد میں سے۔

انجیل کی شہادت

انجیل میں بھی حضرت مریمؑ کے خاندان کے متعلق ایک ایسا اشارہ موجود ہے جو کہ قرآن مجید کی تائید میں ہے۔ افسوس کہ عیسائی اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ لوقاؔ میں لکھا ہے کہ زکریا کاہن کی بیوی الیصبات ہارون کی نسل میں سے تھی اور اس کی بیٹیوں میں سے ایک بیٹی۔ اسی باب میں آگے چل کر لکھا ہے کہ حضرت مریمؑ اور الیصبات آپس میں قریبی رشتہ دار تھیں۔ (آیت ۳۶)

مسٹر ڈویری (Wherry) نے اپنے ترجمہ قرآن میں یہ تسلیم کیا ہے کہ حضرت مریمؑ لیوی خاندان یعنی نسلِ عمران سے تھیں۔ کیونکہ الیصبات ان کی قریبی رشتہ دار تھیں الفاظ یہ ہیں:-

"because she was of the Levitical race, as by her being related to Elizbeth it would seem she was.

حضرت مریم لیوی خاندان سے تھیں۔ چونکہ وہ الیصبات کی رشتہ دار تھیں (جیسے انجیل میں ہارون کے خاندان میں سے بیان کیا گیا ہے) اسلئے مریم کا اُختِ ہارون قرار دیا جانا ممکن ہے"

اس تحقیق سے ظاہر ہے کہ قرآن مجید نے بنتِ عمران اور اُختِ ہارون کے خطاب میں ایک تاریخی حقیقت کا انکشاف کیا ہے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی وضاحت

اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پروفیسر حتی کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ بانیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم مریم اُختِ ہارونؑ اور مریم والدہ یسوع ناصریؑ میں امتیاز نہیں کر سکے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بخوبی علم تھا کہ حضرت ہارونؑ کی حقیقی بہن والدہ یسوع ناصری نہیں تھیں بلکہ ان کو صرف اُختِ ہارون کا نام دیا گیا۔ ڈاکٹر حتی جیسے فاضل مؤرخ کو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ یہی اعتراض نجران کے عیسائیوں نے بانیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر حضرت مغیرہؓ پر کیا

کو کیا آپ کو معلوم نہیں کہ قرآن میں مریم کو اُختِ ہارون کہا گیا؟ اور یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ مسیح حضرت موسیٰؑ کے ایک لمبے عرصے کے بعد پیدا ہوئے" حضرت مغیرہؓ نے واپس پہ یہ اعتراض رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ آپ نے یہ جواب کیوں نہ دیا کہ بنی اسرائیل اپنے آباؤ اجداد اور مقدسین کے ناموں پر اپنے بچوں کے نام رکھتے ہیں۔ (ترمذی) صاف ظاہر ہے کہ یہ اعتراض آج سے چودہ سو سال پہلے صاف ہو چکا ہے۔ کہ اُختِ ہارون حضرت مریمؑ کو اسلئے نہیں کہا گیا کہ وہ ہارون کی حقیقی بہن تھیں بلکہ اُختِ ہارون آپ کو اسلئے کہا گیا کہ آپ کا نام حضرت ہارونؑ کی بہن کے نام پر مریم رکھا گیا۔ اور آپ اسی خاندان سے تھیں۔

دوسرا اعتراض

پروفیسر فلپ حتی نے دوسرا اعتراض یہ کیا ہے کہ قرآن مجید نے ہامان کو فرعونِ موسیٰ کا ہمعصر قرار دیدیا۔ حالانکہ ہامان پانچویں صدی قبل مسیح کے ایک فارسی بادشاہ کا وزیر تھا۔ نہ کہ تیرہ سو سال قبل مسیح سے تعلق رکھنے والے فرعون کا مصاحبِ اعلیٰ یا وزیر۔

اس اعتراض کی بنیاد بائیبل کے عہد عتیق میں "آستر" کی کتاب پر ہے۔ اس کتاب کے تیسرے باب میں لکھا ہے:۔

"ان باتوں کے بعد اخسویرس بادشاہ نے اجاجی ہمداتا کے بیٹے ہامان کو ممتاز اور سرفراز کیا اور اس کی کرسی کو سب امراء سے جو اس کے ساتھ تھے بلند کیا۔"

اس حوالہ کی بنیاد پر پروفیسر فلپ حتی قرآن مجید کی تاریخی حیثیت پر معترض ہیں کہ قرآن مجید نے پانچویں صدی قبل مسیح کے ہامان کو فرعونِ موسیٰؑ کا مصاحبِ اعلیٰ کیوں قرار دے دیا۔

آستر کی کتاب کی تاریخی حیثیت

پروفیسر حتی جیسے فاضل انسان سے یہ امر پوشیدہ نہ ہوگا کہ جس کتاب کی بنیاد پر وہ قرآن مجید کی تاریخی حیثیت کو مخدوش ثابت کرنا چاہتے ہیں وہ کتاب تاریخی لحاظ سے ساقط الاعتبار اور مخدوش ثابت ہو چکی ہے۔ یہ امر ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ پانچویں صدی قبل مسیح کے فارسی بادشاہ کا کوئی وزیر یا مصاحبِ اعلیٰ ہامان نامی نہیں تھا۔ نہ اس کی بیوی۔ (جیسا کہ آستر کی کتاب میں بیان ہوا ہے) کوئی یہودی عورت تھی[1]۔ اس بادشاہ کے زمانہ میں یہودیوں کے قتلِ عام کا حکم نہیں دیا گیا۔ اور نہ ہی ہامان کے قتل کے بعد یہودیوں کو بادشاہِ وقت کی طرف سے اجازت دی گئی کہ وہ اپنے ہزاروں دشمنوں کو بے دریغ تہ تیغ کر سکتے ہیں۔ یہ سب خلافِ تاریخ واقعات اس کتاب میں بیان ہوئے ہیں۔ اس کتاب کے آخر میں یہودیوں کے دشمن ہامان سے نجات حاصل کرنے کی یاد میں عید پُوریم منانے کا ذکر ہے۔ جس میں یہود ہامان کا نام

---

[1] ہارپرز بائیبل ڈکشنری از ملر میں زیر لفظ Esther لکھا ہے۔ کہ آستر کی یہ داستان محض خیال آرائی ہے اور اس کی خصوصیت مبالغہ انگیزی۔ کوئی تاریخی ریکارڈ موجود نہیں کہ فارسی بادشاہ اخسویرس کی بیوی کوئی آستر نامی عورت تھی۔ نہ یہ کہ اس کی کوئی ملکہ یہودی تھی۔

لکھ کر اُسے اظہارِ نفرت کے لئے پیٹتے ہیں اور آستر کی کتاب پڑھتے ہیں اور ہامان پر بلند آواز سے لعنت کرتے ہیں۔ تاریخی لحاظ سے ثابت ہے کہ یہ عید مکابیوں کے زمانہ میں یعنی دوسری صدی قبل مسیح میں سکندر اعظم کے جانشین یونانی بادشاہوں سے نجات حاصل کرنے کی یاد میں منائی گئی۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں اِس عید کا نام ونشان نہیں مل سکا۔ اِس کتاب کا زمانہ تصنیف کم وبیش ۱۲۵ ق۔م سمجھا گیا ہے اور اس کے واقعات کو تاریخی درجہ نہیں دیا گیا بلکہ محض ایک افسانہ قرار دیا گیا ہے[1]۔ تازہ تحقیق یہی ہے کہ دوسری صدی قبل مسیح میں یہودیوں پر یونانی بادشاہوں کی طرف سے مظالم کا مہیب سلسلہ شروع ہوا۔ اِنہی مظالم کے پسِ منظر میں یہ افسانہ ترتیب دیا گیا۔ اِس افسانہ کے بیشتر کیریکٹر فرضی ہیں۔ ایک یہودی خوبصورت عورت ہدساہ نامی جس نے بادشاہ کی ملکہ بنا تھا اس کو آستر کہا گیا۔

اِشتر دراصل بابلی محبت کی دیوی کا نام تھا۔ آستر کے سرپرست کا نام مردکی آیا ہے۔ مردوک بابل کا خدائے اعلیٰ تھا۔ یہ اسماء ظاہر کرتے ہیں کہ اِس کتاب کی اصلیت میسوپوٹامیہ سے تعلق رکھتی ہے[2]۔ محققین بیک زبان پکار رہے ہیں کہ اِس کتاب کے بیشتر کیریکٹر فرضی ہیں۔ یہ ایک غیر مذہبی افسانہ ہے جس میں خدائے یہوواہ کا نام تک نہیں آیا۔ اِس میں دوسری صدی قبل از مسیح کے مظالم کا نقشہ "حکایتِ دیگراں" کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔

آبائے یسوعیین بھی اِس کتاب کی قانونی حیثیت پر متفق نہیں ہیں۔

مارٹن لوتھر کی رائے

مارٹن لوتھر کا قول ہے کہ مجھے یہ کتاب اتنی ناپسند ہے اور مَیں اِس سے اتنا بیزار ہوں کہ اچھا ہوتا یہ کتاب نہ لکھی جاتی۔ کیونکہ اس میں یہودیت اور ملحدانہ شرارت پائی جاتی ہے۔ (ہارپرز بائیبل ڈکشنری از ملر زیر لفظ آستر)

یہ کتاب کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں میں بھی وجہِ اختلاف ہے۔ پروٹسٹنٹ بائیبل میں اِس کے دس ابواب ہیں لیکن کیتھولک بائیبل میں یہ کتاب سولہ ابواب پر مشتمل ہے کیتھولک بائیبل میں جو زائد حصہ ہے اس میں پہلے حصہ کے خلاف ہامان کو مقدونی قرار دیا گیا ہے۔ (۱۶ باب)

مختصر یہ کہ اِس کتاب کی تاریخی حیثیت اس قدر مخدوش ہے کہ اس پر صحیح تنقید کی بنیاد رکھنا بجائے خود ایک تاریخی غلطی ہے۔ اور پروفیسر حتی جیسے فاضل مؤرخ کی شان سے بعید تھا کہ وہ اِس قسم کی کمزور بنیاد کے پیشِ نظر قرآن مجید کی تاریخی حیثیت پر اعتراض کرتے۔

ہامان محض افسانوی شخصیت تھا

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ دوسری صدی قبل مسیح کے اِس افسانہ میں ایک ایسے وزیر کو جس نے یہودیوں کے قتلِ عام کا حکم دیا ہامان کے نام سے کیوں پکارا گیا؟ یہاں یہ مدنظر رہے کہ بائیبل میں صرف آستر کی کتاب ہی میں ایک ظالم وزیر کو ہامان کا نام نہیں دیا گیا بلکہ

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو پیکس تفسیر بائیبل میں "آستر" کی شرح۔ نیز ہارپرز بائیبل ڈکشنری از ملر زیر لفظ Esther۔

[2] ہارپرز بائیبل ڈکشنری از ملر زیر لفظ Esther۔

"دشمن اسرائیل یاجوج" کو بھی ہامون کے نام سے پکارا گیا ہے۔
چنانچہ حزقی ایل میں لکھا ہے۔ کہ یاجوج اپنی تباہی کے بعد جس
وادی میں دفن کیا جائے گا اس کا نام "ہامون جوج"[۱] ہوگا۔
اور اس نام کی نسبت سے شہر بھی "ہاموناہ" کہلائے گا۔
(حزقی ایل ۳۹/ ۱۱-۱۶) ظاہر ہے کہ یاجوج کو یہاں ہامون کہا
گیا۔ تبھی اس کے مدفن کا نام "ہامون جوج" ہوا اور شہر کا نام
"ہاموناہ"۔ اب بات صاف ہے۔ آستر کی کتاب میں ایک
دشمنِ یہود وزیر کو ہامان کہا گیا۔ حزقی ایل کی کتاب میں یاجوج
دشمنِ اسرائیل کو ہامون کا لقب دیا گیا۔ صاف ظاہر ہے
کہ قدیم یہودیوں کے نزدیک ہامان نام اسرائیل کے
دشمنوں کے لئے مستعمل تھا۔ ان کے نزدیک یہ ایک بُرا
لقب تھا۔ جو کہ ہر اس شخصیت کو دیا جا سکتا ہے جو کہ
اپنے زمانہ میں یہود پر ظلم و ستم روا رکھنے والوں کا سردار
اور سربراہ ہو۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہود اپنی روایات
کی رُو سے یہ جانتے تھے کہ اُن کی تاریخ میں ہامان ایک
نہایت ظالم اور متکبر شخصیت گزری ہے لیکن وہ
مطلقاً بھول چکے تھے کہ یہ شخصیت کون تھی۔ قرآن مجید
نے سب سے پہلی دفعہ اس راز سے پردہ اُٹھایا کہ ہامان
در اصل بنی اسرائیل پر ظلم و ستم روا رکھنے کے لئے فرعونِ
مصر کا آلۂ کار اور اس کا دستِ راست تھا۔ یہ عجیب
بات ہے کہ قرآن مجید نے جہاں جہاں بھٹکی ہوئی تاریخ
کو سیدھا راستہ دکھایا اُسی جگہ یہود و نصاریٰ اور
مستشرقین معترض ہوئے۔ انہوں نے تحقیق کی تکلیف
گوارا نہ کی اور فوراً اعتراض کر دیا کہ قرآن مجید تاریخ
کے خلاف جا رہا ہے۔

ہامان کون تھا؟

پروفیسر حتی کا اعتراض یہ تھا کہ قرآن مجید میں
فرعونِ موسیٰ کے مصاحبِ اعلیٰ کا نام ہامان آیا ہے۔
حالانکہ پانچویں صدی قبل مسیح میں ایک فارسی بادشاہ کا
منظورِ نظر درباری یا وزیر تھا۔ گزشتہ حصہ مضمون
میں یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ بائیبل میں فارسی بادشاہ کے
جس وزیر کا نام ہامان آیا ہے وہ محض افسانوی شخصیت
ہے، کوئی تاریخی وجود نہیں۔

دوسری طرف مصر کی تاریخ قدیم اور اس کے
آثارِ قدیمہ کی شہادت موجود ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام
کے زمانہ میں فرعون کے بعد سب سے بڑی شخصیت آمان یا
آمون کے کاہنِ اعظم کی تھی۔ آمون دیوتا مصر کے سب
دیوتاؤں سے بڑا اور اُن کا رئیس اعلیٰ تھا۔ ابھی تک مصر کے

[۱] "ہامون جوج" کے معنی عبرانی کی رُو سے علماءِ بائیبل نے "جوج
کی وہ جمعیت" کئے ہیں۔ ھا کے معنی عبرانی اور دوسری
سامی زبانوں میں "دیکھو" یا "وہ ہے" کے ہیں۔ یہ استفہام
ہے یا حرفِ تنبیہہ۔ باقی حصہ کے معنی عبرانی کی رُو سے "انبوہ
یا جمعیت" کئے گئے ہیں۔ میری تحقیق میں یہ مصری زبان کا
لفظ ہے۔ "ھا" کے معنی تو وہی ہیں۔ لیکن آمون
مصریوں کے خدائے اعلیٰ کا نام تھا اور مصریوں کے
بہت سے اسماء کا ایک جزو۔ فرعونِ موسیٰ کے کاہنِ
اعظم کا لقب "آمون کا کاہن یا ہامان" تھا۔ یعنی وہ ہے
آمان کا مظہر یا کاہن +

آثار قدیمہ سے اسکا لقب بعینہٖ ہامان میری نظر سے نہیں گزرا۔ ہاں اس سے ملتا جلتا لقب "آمان کا کاہن" ضرور نکلا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی وہ شخصیت ہے جسے قرآن مجید نے ہامان کہا ہے۔ قرین قیاس یہی ہے کہ جس طرح فرعون بادشاہ مصر کا لقب تھا اسی طرح "آمان کے کاہن اعظم" کا لقب ہامان تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں آمان کے کاہن اعظم کا اقتدار انتہائی عروج پر تھا۔ یہ ناممکن ہے کہ فرعون مصر تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کے درپے ہو اور کاہن اعظم نہ ہو۔ جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر سیاسی تفوق حاصل کرنے کے الزام کے علاوہ یہ الزام بھی عائد تھا کہ یہ شخص مصر کے اعلیٰ مسلک و مذہب کو تباہ کرنے والا ہے۔ ویذهبا بطریقتکم المثلیٰ (طٰہٰ آیت نمبر ۶۳) اِنّی اخاف ان یبدل دینکم (مومن آیت ۲۶)

یہ شخص نہ فرعون کو خدا کا اوتار مانتا ہے اور نہ فرعون کے اِلٰہ کو مانتا ہے۔ ویذرک والھتک (اعراف آیت ۱۲۷)

مَلَاءِ فرعون کا یہ اعتراض ظاہر کرتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف مذہبی تعصب پورے جوش پر تھا۔ مختلف دیوتاؤں کے کاہن اور ان کاہنوں کا سردار "کاہن آمان" یقیناً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف مذہبی تعصب اور تکفیر کی آگ بھڑکانے میں پیش پیش تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے فرعون، ہامان اور مَلَاءِ فرعون کا ذکر کیا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت میں ملت واحدہ بن چکے تھے۔

مصری اسماء میں آمون کا لفظ

پھر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مصری اسماء اور القابات میں آمون یا آمان کا لفظ اسی طرح ایک جزو کے طور پر شامل نظر آتا ہے جس طرح مسلمانوں کے اسماء میں اللہ کا لفظ پایا جاتا ہے تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ ہامان کے لقب میں بھی آمان دیوتا کا نام بطور جزو کے شامل ہے۔ خود فرعون موسیٰ رعمسس دوم کے لقب کے بعد "میری آمن" کا لفظ ملتا ہے۔ اسی طرح دوسرے فراعنہ اور اکابر مصر کے اسماء اور القابات میں آمون کا نام بطور جزو کے شامل ہے۔ مثلاً

۱۔ آمن آردس
۲۔ آمن امحاب
۳۔ آمن امحت
۴۔ آمن الیوبت
۵۔ آمن ہوتپ یا آمان ہاتپ
۶۔ آمنی
۷۔ آمن میس
۸۔ شاشانک میری آمن[۵۱]

مصری اسماء کے شروع میں حرف "ھا" بھی کئی جگہ ملتا ہے۔[۵۲] اس سے ظاہر ہے کہ ہامان کا نام ھا اور آمان سے

---

۵۱ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو A History of Egypt by James Henry Breasted P. 604 (Index)

۵۲ تاریخ مصر از بریسٹڈ انڈکس ص ۶۱۳

مرکب ہے۔

مصر کے آمون دیوتا کا نام قدیم ایام میں "آمان" مشہور تھا۔ بعد میں آمن، آمان یا آمون نام مروّج ہوا۔ آمون کے معنی مصری زبان میں "غیر مرئی" ہستی کے ہیں۔ سورج کے دیوتا کو "رع" کہتے تھے جب سورج دیوتا اور آمون دیوتا کی پرستش یکجائی طور پر کی جانے لگی تو مشترک دیوتا کا نام "آمون رع" ہوگیا۔[1]

جس طرح مذکورہ اسماء میں آمون یا آمان کا لفظ بطور جزو پایا جاتا ہے اسی طرح ہامان کا لفظ "ھا" اور "آمان" سے مرکب ہے۔

ہامان کے معنی کیا ہیں؟

حرف "ھا" سامی زبانوں میں استفہام کے لئے ہے یا حرف تنبیہہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے علماء بائبل نے بھی حزقی ایل ۱۱/۲۹ کے حاشیہ پر ہامون کے معنی "وہ ہے جمعیت" کے دیئے ہیں۔ گو انہوں نے عبرانی کی رو سے یہ معنے دیئے ہیں لیکن اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہامون کا لفظ "ھا" اور "آمون" سے مرکب ہے۔ ھا کے معنے ہیں "دیکھو"[2] یا "وہ ہے" اور آمون عبرانی لفظ نہیں بلکہ مصری دیوتا کا نام ہے۔ آمون کے کاہن اعظم کو اختصاراً ہامون کے لقب سے یاد کرنا بالکل قرین قیاس ہے۔ اور معنے یہ ہوں گے:۔

"دیکھو وہ ہے (کاہن) آمان"

تاریخ قدیم اور آثار قدیمہ کی شہادت

تاریخ اور آثار قدیمہ کی شہادتوں سے ثابت ہے کہ قدیم مصر میں اٹھارھویں خاندان کے زمانہ حکومت یعنی سولھویں صدی قبل مسیح سے آمون کے کاہن اعظم کا اثر و رسوخ بڑھنا شروع ہوا آمون کے معبدوں کے لئے بڑی بڑی جاگیریں، مال غنیمت اور جنگی قیدیوں کے گروہ در گروہ وقف کر دیئے گئے۔ اور سارے ملک میں عظیم الشان مذہبی عمارات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ بے پناہ اموال، جائداد اور خزائن کی وجہ سے آمون کے کاہن اعظم کا اثر و رسوخ انتہا کو پہنچ گیا اور حکومت بھی یکسر مذہبی حکومت کا درجہ حاصل کر گئی۔ برسر اقتدار آنے والے فرعون کے لئے ضروری تھا کہ وہ آمون کے کاہن اعظم کا اعتماد حاصل کر لے۔ آہستہ آہستہ فرعون کے بعد دوسرا درجہ کاہن اعظم کو مل گیا اور کہانتِ عظمیٰ کا عہدہ نسلی بادشاہت کی طرح کاہن اعظم کی نسل میں منتقل ہونا شروع ہوا۔

کاہن اعظم کی بیوی ملکہ کے بعد دوسرے درجہ پر سمجھی جاتی۔ خزانے کا بہت بڑا حصہ کاہن اعظم کے مطالبات کی نذر ہو جاتا۔ یہاں تک کہ "نوبیا" میں سونے کی کانوں کا علاقہ آمون کے لئے وقف کر دیا گیا اور آمون کا کاہن اعظم اس علاقہ کا مختار کُل ہوگیا۔

ہامان مصر کا کاہن اعظم تھا

فرعون موسیٰ کے زمانہ میں ہامان کی شخصیت کو

---

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو Helps to the study of the Bible "Bible illustrations" P. 16

[2] عبرانی میں رحمٰن کو یہودی "ھا رحمن" کہتے ہیں۔

پہچاننا کوئی مشکل کام نہیں۔ تاریخ اور آثارِ قدیمہ کے دھندلکوں
میں ہامان کی شخصیت بالکل اُبھری ہوئی نظر آتی ہے۔
جیمس ہنری بریسٹڈ اپنی کتاب تاریخ مصر میں لکھتے ہیں:۔
"مصر میں آمون دیوتا کے نام پر اکٹھی
کی ہوئی دولت اور اس کے نام پر حاصل
کی ہوئی طاقت جیسے جیسے بڑھتی گئی۔
مصر کے دارالخلافہ تھیبس میں معبد آمون
کا کاہنِ اعظم سیاسی لحاظ سے زیادہ
سے زیادہ اہم شخصیت بنتا گیا۔ یہ یاد
رہے کہ معبدِ آمون کا کاہنِ اعظم اس
مقدس تنظیم کا سربراہ تھا جس نے ملک کے
تمام مذہبی اداروں یا کلیسائی نظام کو
اپنے اندر ضم کر رکھا تھا۔ اس طرح ایک
انتہائی بارسوخ سیاسی گروہ اس کے
زیرِ اقتدار تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آمون کا
کاہنِ اعظم فرعونِ مصر "مرنی فتاح" یا
غالباً اس کے باپ رعمسیس دوم کے
زمانہ سے ہی اتنا آگے بڑھ گیا کہ وہ اس
قابل ہو گیا کہ اپنے بیٹے کو از خود اپنا
جانشین مقرر کر سکے۔ اس طرح اس نے
اپنے خاندان کو مصر کے ایک مضبوط ترین
مذہبی ادارے کا سربراہ بنا دیا۔ ظاہر ہے
کہ ایک شاہی خاندان کی طرح کسی دوسرے
خاندان کا ملک میں تفوق خطرے سے خالی
نہ ہوتا۔ چنانچہ یہاں بھی یہی ہوا کہ
انجامِ کار کاہنوں کے ہاتھوں فرعونِ مصر
کو اپنے تخت و تاج سے محروم ہونا پڑا۔
اگرچہ عملاً آمون کے بڑھتے ہوئے اقتدار
کی وجہ سے یہ حادثہ کم و بیش ڈیڑھ سو
سال بعد پیش آنے والا تھا۔ لیکن
اس اثناء میں ہی آمون کے کاہنِ اعظم
کی طاقت اور اس کا اثر و رسوخ اتنا
ترقی کر چکا تھا کہ فرعون کے ساتھ ساتھ
ملکی خزائن پر کاہنِ اعظم کا اختیار بھی
نئے نئے مطالبات کی صورت میں بڑھتا
چلا گیا۔ یہاں تک کہ اُنیسویں خاندان
کے اختتام سے پہلے ہی حالت یہ ہو گئی
کہ آمون کے نام پر "نوبیا" میں سونے
کی کانوں کے علاقہ پر کاہنِ اعظم کو پورا
اختیار حاصل ہو گیا۔ اور یہ علاقہ مملکتِ
آمون کی طلائی سرزمین کے نام سے
موسوم ہوا۔[1]"

۲۔ ایک فرانسیسی ماہر مصریات اپنی کتاب میں لکھتا ہے:۔
"قدیم مصر میں بہت سے دیوتاؤں
کی پرستش ہوتی تھی۔ ہر شہر کا تعلق ایک
خاص دیوتا یا چند خاص دیوتاؤں سے
ہوتا تھا۔ شہر تھیبس کے لوگ اپنے مخصوص
دیوتا کو آمن کہتے تھے۔ جب یہ شہر ملک

[1] A History of Egypt by Breasted P. 456-457

مصر کا پایہ تخت ہو گیا۔ تو آمن نے رفتہ رفتہ
سب دیوتاؤں پر برتری حاصل کر لی۔
اور سب سے زیادہ معزز مان لیا گیا۔ ہر
دیوتا کا الگ ایک معبد، چند خادم اور
کاہن ہوتے تھے۔ آمن کی پرستش میں
ترقی کے ساتھ ساتھ آمن کے خدام
اور کاہنوں کے رئیس نے رفتہ رفتہ
احترام اور اقتدار کامل حاصل کر لیا۔
اور بے شمار املاک اور بے حد نقد و
جنس جو آمن کے لئے وقف تھی اس
کے قبضہ میں آ گئی اور وہ معبد آمون جیسے
عظیم الشان مندر کی متعلقہ عمارات
کی تولیت پر بھی قابض ہو گیا۔ رامسس
دوازدہم کے زمانہ سلطنت میں آمن
کے بڑے کاہن نے جس کا نام "ہیر ہر"
تھا اپنے آپ کو مصر علیا و سفلی کا سب
سے زیادہ معزز شخص اور کل فوج کا
سردار اور دونوں سلطنتوں کا مالک
قرار دے دیا۔

رامسس دوازدہم کے بعد اس
نے دونو تاج اپنے سر پر رکھے جن میں
سے ایک سلطنت کا تاج اور دوسرا
کاہنوں کی سرداری کا تاج تھا اور
"معبد آمن کے اوّل کاہن" کے لقب
سے سلطنت مصر کی حکمرانی میں مصروف
ہوا۔"[1]

۲۔ جیمس ہنری بریسٹڈ نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب
تاریخ مصر میں کاہنِ اعظم کے اقتدار کی مزید
تفصیلات بایں الفاظ دی ہیں:-

"مصر کے نئے دورِ حکومت میں فوجی
طاقت کے ساتھ ساتھ ایک نئی مؤثر
قوت جو کہ قدیم نظامِ کہانت پر مبنی تھی،
اُبھرنا شروع ہوئی۔ سلطنتِ مصر میں
معبدوں کی بے پناہ دولت کا یہ قدرتی
نتیجہ تھا کہ کہانت ایک مخصوص پیشہ کی
صورت اختیار کر گئی ..... جیسے جیسے
کاہن تعداد میں بڑھتے گئے وہ زیادہ سے
زیادہ سیاسی رسوخ حاصل کرتے گئے۔
جب معبدوں کی دولت و ثروت میں
بے پناہ اضافہ ہو گیا تو ان کے انتظام
و انصرام کے لئے ایک منظم جمعیت یعنی
تمام انتظامی امور سے تعلق رکھنے والے
افسران کی ضرورت محسوس ہوئی جن کا اس
سے پیشتر کے زمانہ میں کوئی وجود نہ تھا۔
...... ملک کے تمام الگ الگ دیوتاؤں
کے کلیسائی نظام اب ایک عظیم الشان
ملک گیر تنظیم کے تحت متحد ہو گئے۔ اس تنظیم
کا رئیس دارالسلطنت تھیبس میں واقع

[1] تاریخ ملل قدیمہ (ترجمہ از انجمن ترقی اردو) ص ۲۹۰

ریاست معبدِ آمون کا کاہنِ اعظم تھا اور اس طرح کاہنِ اعظم کی طاقت پہلے کی نسبت کئی گنا بڑھ گئی .... فراعنہ مصر نے جب دولت مفتوحہ ممالک سے حاصل کی۔ اس کا بیشتر حصہ معبدوں کو نذر کر دیا گیا۔ معبد وسیع اور عالیشان محلات کی صورت اختیار کر گئے۔ جن میں کاہنوں کے گروہ در گروہ تھے اور آمون کا کاہنِ اعظم اس وسیع تر مذہبی تنظیم کا رئیسِ اعلیٰ تھا۔ وہ فی الحقیقت ایک مقدس شہزادہ سمجھا جاتا۔ اور بے پناہ سیاسی قوت کا مالک بن جاتا۔ کاہنِ اعظم کی بیوی "خداوند کی کنیزِ اعلیٰ" کے لقب سے یاد کی جاتی اور اسے گویا ملکہ کا درجہ حاصل ہو گیا" (تلخیص ص۲۴۷ و ص۲۴۸)

۴۔ اسی کتاب میں آگے چل کر معبدِ آمون کی بے پناہ دولت و ثروت کی تفصیلات دینے کے بعد لکھا ہے:-

"آمون کے کاہنِ اعظم کی ریاست اور اس ریاست کے محاصل اتنے ترقی کر گئے کہ وہ بادشاہ سے دوسرے درجہ پر پہنچ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک میں کاہنِ اعظم کو ایک اہم اقتصادی پوزیشن کا مالک سمجھا جاتا اور سیاسی قوت کاہنوں کے ایک بااثر گروہ کے ہاتھ میں آ گئی۔ جو کہ عظیم الشان دولت و ثروت کو سنبھالے ہوئے تھے۔ وہ اتنی طاقت حاصل کر گئے کہ فرعون انہیں نظر انداز نہ کر سکتا تھا۔ کاہنِ اعظم اور کاہنوں کی مرضی اور رضا کے بغیر کوئی فرعون زیادہ دیر برسرِ حکومت نہ آ سکتا تھا ..... (تلخیص ص۲۹۴)

۵۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں زیرِ لفظ Egypt جو مقالہ دیا گیا ہے اس میں "مذہب مصر" کے عنوان کے نیچے زیادہ تر وہی باتیں بیان ہوئی ہیں جو کہ اوپر آ چکی ہیں۔ خلاصہ یہ ہے:-

"کاہن مصر میں ایک اہم اور بارسوخ شخصیت تھے۔ اور یہ اہمیت ۱۸ ویں خاندان سے شروع ہوئی۔ جب تھیبس (دار السلطنت) میں معبدِ آمون کو شرع کی کلیسا کو ایشیا کی فتوحات میں سے حصہ ملنا شروع ہوا اور وہ دولت و ثروت اور طاقت و قوت میں بامِ عروج پر پہنچ گئے"۔ (ص۵۲)

تاریخی نتائج

ان تفصیلات سے ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں یعنی رعمسیس دوم اور منفتاح کے دورِ حکومت میں بادشاہ کے بعد دوسرے درجہ پر "آمان کا کاہنِ اعظم" سمجھا جاتا۔ وہ دولت و ثروت اور بے پناہ سیاسی قوت کا سرچشمہ تھا۔ آمون کو دیوتاؤں کا

بادشاہ اور آمون کے کاہنِ اعظم کو سب کے سب مذہبی اداروں کا رئیسِ اعلیٰ قرار دے دیا گیا اور اموالِ غنیمت کا بیشتر حصہ معبدِ آمون کی نذر ہوتا۔ جنگی قیدی گروہ در گروہ معبدِ آمون میں لائے جاتے۔ کچھ دیوتا کے حضور بھینٹ چڑھا دیئے جاتے اور باقی مذہبی عمارات، مقابر کی تعمیر اور اصنام گری پر شب و روز کام کرتے۔ ریاستِ آمون کی دولت و ثروت کی تفصیلات پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پاپائے روم اپنے زمانہ عروج میں بھی شاید اس کے سامنے بے حیثیت ہے۔ بعض کاہنِ اعظم اپنے مذہبی فرائض کے علاوہ وزیرِ خزانہ اور وزیرِ اعظم کے منصب پر پہنچے اور افواج کو بھی انہوں نے "رئیس افواج" کی حیثیت سے کمانڈ کیا۔ بعد کے زمانہ میں تو وہ اتنا رسوخ حاصل کر گئے کہ فرعون کی جگہ بھی انہوں نے خود لے لی۔ اس سے پہلے بھی فوجوں میں انہیں عمل دخل حاصل تھا۔ کیونکہ ان کے واسطہ سے اعلانِ جہاد کے ذریعہ لوگوں کو فوجی خدمت کے لئے مائل کیا جاتا۔ فرعونِ موسیٰ (رعمسیس دوم) کی فوج میں سب سے بڑا ڈویژن جسے بادشاہ خود کمانڈ کرتا "جنودِ آمون"[1] کے نام سے موسوم تھا۔ قرینِ قیاس ہے کہ یہ ڈویژن معبدِ آمون کے کاہنِ اعظم کی کوششوں کا ثمرہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے آمون کے نام سے نسبت دی گئی۔

چونکہ آمون کے کاہنِ اعظم کے زیرِ انتظام عظیم الشان مذہبی عمارات کی تعمیر ہر وقت جاری رہتی اس لئے اُسے صناعوں کے "رئیسِ اعلیٰ" کا خطاب بھی دیا گیا۔[2]

ہامان کا ذکر قرآن میں

ان تفصیلات کا مقابلہ اب فرعون و ہامان پر مشتمل قرآنی بیانات سے کیجئے۔ صاف ظاہر ہو جائیگا کہ ہامان سے مراد آمون کا کاہنِ اعظم ہے۔

قرآن مجید کا یہ کمال ہے کہ اس نے بعض ایسی شخصیتوں کا ذکر کیا ہے جو کہ موجود الوقت تاریخ میں محفوظ نہ تھیں۔ عصرِ حاضر کے آثارِ قدیمہ انہی شخصیتوں پر روشنی ڈالتے ہیں اور اس طرح قرآن مجید کی صداقت کا چمکتا ہوا ثبوت مہیا ہو رہا ہے۔ قرآن مجید میں جُنُودھُما کے الفاظ میں فرعون اور ہامان دونوں کے جُنود کا ذکر ہے۔ اِنَّ فرعون وھامان وجُنودھما کانوا خٰطئین ۰ (قصص) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہامان کو بھی فوجوں میں عمل دخل تھا۔ فرعون کے سب سے بڑے ڈویژن کا نام ہی آثارِ قدیمہ سے "جنودِ آمون" برآمد ہوا ہے۔ آمون کی ریاست میں بے پناہ عملہ اور فوجی قوت اسکے علاوہ ہے جو کہ براہِ راست کاہنِ اعظم کے تحت تھی۔ پھر قرآن میں بیان ہوا ہے کہ فرعون نے ہامان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ کہ میرے لئے پختہ اینٹوں کی ایک ایسی بلند و بالا[3] عمارت بنایئے۔ کہ میں موسیٰ کے خدا کو دیکھ سکوں

[1] تاریخِ مصر از بریسٹڈ صفحہ ۲۲۵

[2] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا زیرِ لفظ "مصر" صفحہ ۵۲۴)

[3] تورات میں مینارِ بابل کے ذکر میں اس قسم کے الفاظ آئے ہیں کہ مٹی پر آگ جلاؤ اور پختہ اینٹوں سے ایک برج بناؤ۔ اس برج پر خدا اُترتا ہے۔ قدیم قوموں میں بلند مینار پر خدا کے اُترنے کا خیال پایا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فرعون نے یہ تجویز پیش کی (ملاحظہ ہو پیدائش ۱۱/ ۱تا۹)

فَاَوْقِدْ لِیْ یَاھَامَانُ عَلَی الطِّیْنِ فَاجْعَلْ لِّیْ صَرْحًا لَّعَلِّیْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓی اِلٰہِ مُوْسٰی (قصص)

بلند میناروں پر ارواح کے آنے، دیوتاؤں اور خدا کے اُترنے کا تصور سامی قوموں میں موجود تھا۔ فرعون نے ہامان کو کہا کہ بلند و بالا عمارات بنائیے تاکہ موسٰیؑ کے خدا کو دیکھا جا سکے۔ فرعون نے مذہب سے تو مذاق ہی کیا تھا لیکن اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی عمارات کی تعمیر کا کام ہامان کی سپردگی میں تھا۔ چنانچہ مصر کے آثارِ قدیمہ سے ثبوت مل گیا کہ کاہنِ اعظم کا خطاب صناعوں کا رئیس اعلٰی بھی تھا۔[۱] یہ خطاب بھی قرآنی بیان کی تصدیق کر رہا ہے۔ بالکل ممکن ہے کہ آثارِ قدیمہ سے ہامان نام بعینہٖ مل جائے۔ لیکن موجودہ تحقیقات بھی بڑی حد تک قرآنی بیان کی تائید میں ہے۔ مصر کے آثارِ قدیمہ پکار پکار کر بتا رہے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں یعنی تیرھویں صدی قبل مسیح میں سیاسی اور مذہبی اعتبار سے فرعون اور "آمان کا کاہنِ اعظم" دو نمایاں شخصیتیں مصر میں تھیں۔ انہی کو قرآن مجید نے فرعون اور ہامان قرار دیا ہے۔ قرینِ قیاس بھی یہی ہے کہ ہامان سے مراد مذہبی اداروں کا رئیس اعلٰی لیا جائے کیونکہ انبیاء کے خلاف سیاسی اور مذہبی طاقتیں دونوں مجتمع ہو جاتی ہیں۔

اس وضاحت سے ظاہر ہے کہ فرعون و ہامان تاریخی شخصیتیں ہیں۔ فرعون کے ساتھ ہامان کے ذکر میں قرآن مجید نے اپنی تاریخی حیثیت کو ایک تاریخی حقیقت کا درجہ دیدیا ہے۔ ہامان کے ذکر کی وجہ سے قرآن مجید کی تاریخی حیثیت کو مخدوش ثابت کرنے والوں کے لئے ہمارے ان بیانات میں سبق ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں قبولِ حق کی توفیق بخشے آمین۔

ہجرت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمسفر (بقیہ صفحہ ۱۴)

فرمایا "اے سراقہ! تیرا کیا حال ہو گا جب تیرے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن ہونگے"۔ سراقہ نے حیران ہو کر پوچھا "کسریٰ بن ہرمز؟" یعنی شہنشاہِ ایران۔ حضورؐ نے فرمایا۔ ہاں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشگوئی حضرت عمرؓ خلیفہ ثانی کے عہد میں پوری ہوئی۔ گویا وہ بھی خلیفۂ برحق تھے نہ کہ ظالم و غاصب۔

بالآخر سفرِ ہجرت ۱۲ ربیع الاول ۱۴ سنہ نبوی مطابق ۲۸ جون ۶۲۲ء کو پیر کے دن اختتام پذیر ہوا اور حضورؐ مدینہ میں پہنچ گئے۔

مذکورہ بالا ماجرا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفرِ ہجرت میں حضرت ابوبکرؓ اور آپ کے اہلبیت کی خدمات نمایاں نظر آتی ہیں۔ اور اس میں بنو ہاشم کی خدمات کا کوئی حصہ نظر نہیں آتا۔ سوائے اسکے کہ حضرت علیؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں امانتیں واپس کرنے کیلئے ٹھہرائے گئے تھے اور انہیں اس سفر کی صعوبتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کی سعادت نصیب ہوئی۔ یہ وہ واقعات ہیں جن سے کوئی متعصب شخص بھی انکار نہیں کر سکتا۔ پس حضرت ابوبکرؓ ایسے بے نفس اور مخلص شخص کو غاصب اور ظالم کہنا حد درجہ کی زیادتی ہے حالانکہ حضرت علیؓ نے انکو کبھی ایسا نہیں کہا تھا۔

---

[۱] مصر میں اس زمانہ میں ہر جگہ عالی شان مندر، مقبرے، محل اور مربع شکل پیل پائے، بُت اور مورتیں بنائی جاتیں۔ کرنک کا معبد آمون ایک عظیم الشان عمارت تھی جس کے ستون دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

حضرت مولانا عبید اللہ صاحب بسمل کی شاعری

(جناب شیخ محمد احمد صاحب مظہر ایڈووکیٹ لائلپور)

15

نوٹ:- یہ مضمون مجلس فارسی تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں پڑھا گیا۔

مجھے اس بات سے بہت خوشی ہوئی ہے کہ ہمارے کالج نے مجلس فارسی قائم کی ہے جو غالباً دوسرے کالجوں سے ایک مزید امتیاز ہے۔ دراصل اس مجلس کا قیام گویا چُپ کی داد ہے۔ کیونکہ موجودہ ماحول میں ہمارے ملک کے اندر فارسی زبان بے اعتنائی اور غفلت کا شکار ہو رہی ہے۔ علمی قدریں بدل رہی ہیں۔ مادیت کا دَور دَورہ ہے۔ اور توجہات دوسری طرف پھر رہی ہیں۔ بہت کم اشخاص ہیں جن کو فارسی زبان سے لگاؤ باقی رہا ہو۔ گنتی کے چند ایسے آدمی ہوں گے۔ ورنہ فارسی زبان عموماً متروک و مہجور ہو رہی ہے۔ جو علمی دُنیا کا بہت بڑا نقصان ہے۔ لیکن اس کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ فارسی زبان کی قدر و قیمت اور اس کی ضرورت اور اہمیت کم نہیں ہو سکتی۔ ہمارا کثیر اسلامی لٹریچر فارسی میں ہے اور اُردو زبان پر بھی پوری قدرت حاصل نہیں ہو سکتی جب تک فارسی زبان سے آگاہی نہ ہو۔ الّا ماشاء اللہ۔

فارسی زبان بہت شیریں، بہت سہل اور اُس کی گرامر غالباً سب زبانوں کی گرامر سے آسان ہے۔ ان وجوہات سے اِس زبان کے لٹریچر کو بہت اعلیٰ پایہ حاصل ہے۔

عربی زبان چونکہ تمام زبانوں کی ماں ہے اس لئے فارسی زبان کی خوبیاں بھی عربی کی طرف ہی منسوب ہوتی ہیں۔ کل شیءٍ یرجع الیٰ اصلہٖ۔

یہ بھی یاد رکھیں کہ جب آپ فارغ التحصیل ہو کر زندگی کے مختلف شعبوں میں داخل ہونگے تو پاکستان میں بالعموم آپ کو اُردو زبان سے واسطہ پڑے گا اور فارسی کا علم یقیناً ایک امتیاز اور برتری کا موجب ہوگا۔ اگر فارسی زبان سے ناواقفیت ہوگی تو تحریر و تقریر میں کہتری کا احساس باقی رہے گا۔ اور اس کے برعکس فارسی زبان کا علم آپ کی تحریر و تقریر میں دلکشی کا موجب ہوگا۔

ہماری جماعت بھی فارسی زبان کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ کیونکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تصانیف میں عربی اور فارسی دونوں زبانوں کا امتزاج شیر و شکر کی طرح ہے۔ اور درثمین فارسی حضورؑ کا وہ اعلیٰ کلام ہے جس کو سمجھنا اور پڑھنا ہر احمدی کے لئے ضروری ہے

اِن وجوہات کے پیشِ نظر میں نے مجلس فارسی کی دعوت کو شکریہ کے ساتھ قبول کیا تاکہ اپنے خیالات

کا اظہار کر سکوں۔

مجھے فرمایا گیا تھا کہ غالب یا عمر خیام کے فارسی کلام کے متعلق کچھ بیان کروں۔ لیکن یہ مضمون اگر فرسودہ نہیں تو کم از کم عام اور متداول ہو چکا ہے۔ اسلئے مَیں نے مناسب سمجھا کہ اس کی بجائے مولانا بسمل کے کلام کے متعلق بعض خیالات پیش کروں۔ اور کتاب کی بات کہنے کی بجائے آنکھوں دیکھی اور تجربہ میں آئی ہوئی بات سناؤں۔ ولیس الخبر کالمعاینۃ۔

گو ہندوستان کا اہل علم طبقہ بسمل کے علم و فضل اور شاعری کا قائل ہے لیکن ایک عام آدمی کے نزدیک فارسی زبان کی ناقدری کی وجہ سے یہ آفتابِ علم و فضل بادلوں کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ اسلئے اِس بھولے بسرے مضمون کو پھر تازہ کرنا چاہتا ہوں۔ اور بسمل کے کلام اور سیرت کا ایک ورق اِس مضمون میں پیش کروں گا۔

والدین نے آپ کا نام عباد اللہ رکھا تھا۔ مگر آپ کے استاد نے اسے غلط قرار دیکر عبید اللہ نام تجویز کیا۔ بسمل آپ کا تخلص تھا۔ والد کا نام مظہر جمال۔ جو ایک صاحبِ ارشاد بزرگ تھے۔

مولانا بسمل کی پیدائش ۱۸۳۹ء کے قریب معلوم ہوتی ہے جبکہ اِس ملک میں فارسی اور عربی کا چرچا تھا۔ اور یہ زبانیں علم و فضل کا سرمایہ تھیں اور انگریزی زبان ابھی نو وارد ہی تھی۔

حلیہ قد چھوٹا۔ چہرہ متین اور دلکش۔ داڑھی گھنی اور بازیب۔ آنکھیں روشن اور جھکی ہوئی۔ آواز نرم اور شیریں۔ بات بات میں انکسار۔

خداوندِ علم و خداوندِ شرم ٭ سخن گفتنِ خوب و آوائے نرم

ذریعہ معاش طبابت یا علمی کاموں میں ملازمت۔ وطن بسرم کوٹ ضلع گورداسپور۔ پھر امرتسر۔ لاہور۔ بمبئی۔ بھوپال۔ رامپور وغیرہ میں آپ سکونت پذیر رہے۔

آپ کے رشتہ دار بڑے بڑے عہدیدار اور امیر کبیر۔ مگر بسمل ان سب سے بے نیاز اور درِ مولا کے فقیر۔ خدا تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں ؎

با تو گر دست میدہد خویشی
پادشاہی کنم بدرویشی

یعنی اگر خدا تعالیٰ سے تعلق قائم ہو جائے تو درویشی بادشاہی سے بہتر ہے۔

آپ نے بمبئی میں ایرانیوں سے فارسی سیکھی اور کئی شہروں میں متعدد اساتذہ سے فارسی اور عربی ادب اور علمِ طب کی تکمیل کی۔ اور پھر رامپور۔ بھوپال اور حیدرآباد دکن میں کتب خانوں کے مہتمم مقرر رہے۔

آپ کی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا لائبریریاں اپنے سینے کے اندر ڈال لی ہیں اور آپ چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ علم مناظرہ۔ منطق۔ فلسفہ۔ فارسی اور عربی ادب۔ دنیا کے مذاہب کی تاریخ۔ سب پر عبور حاصل کیا۔ شاعری کی۔ لیکن وہ شاعری نہیں جسے حق تعالیٰ نے فی کل واد یھیمون قرار دیتا ہے۔ بلکہ وہ شاعری جسے اُس علام الغیوب نے اِلَّا الَّذِینَ اٰمنوا کے استثناء سے نوازا ہے۔

کشمیر میں ایک شخص بڑے علامہ ہوئے ہیں۔

—— جن کا تخلص شعری تھا۔ علم شعر میں بسمل نے اُن کی شاگردی اختیار کی۔ فرماتے ہیں ؎

بود در شعر شعری کشمیر ❊ خضر رہ رہنما و رہبر و پیر
لیک کردم براہِ کج رفتار ❊ ننگ استاد گشتم آخر کار

آپ کی علمی فضیلت کی بابت چند باتیں یادگار ہیں:۔

اوّل۔ آپ پہلے سُنّی تھے۔ پھر شیعہ ہوتے لیکن کامل تحقیق کرنے کے بعد حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بیعت میں داخل ہوئے اور حضورؑ کے سامنے اپنے اخلاص کے اظہار میں ایک نظم پیش کی۔ جسے سُن کر حضورؑ نے آپ کے کلام کو فردوسی کا ہم رنگ قرار دیا۔ بسمل اس واقعہ کے متعلق فرماتے ہیں ؎

از مسیح اللہ گشتم فیضیاب
یافتم فردوسیٔ ثانی خطاب

ضمناً یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بسمل ایسے فاضل محقق کا احمدیت میں داخل ہونا بجائے خود احمدیت کی صداقت کے ثبوتوں میں سے ہے۔

دوم۔ حضرت خلیفۃ المسیح اوّل رضؓ کا قول ہے کہ عبید اللہ فارسی زبان کا بے نظیر عالم ہے۔

سوم۔ اہلِ ایران اہلِ ہند کی شاعری کے قائل نہیں ہوا کرتے۔ جس طرح کہ لکھنؤ اور دلّی والے اہلِ پنجاب کی اُردو دانی کے قائل نہیں ہوتے۔ علی حزین کے متعلق مشہور ہے کہ جب ان کے پاس مثنوی غنیمت کا ذکر ہوا تو انہوں نے کہا ؎
غنیمت از پوچ گویانِ ہند غنیمت است۔

غرضیکہ اہلِ ایران اہلِ ہند کی فارسی اور اُن کی شاعری کو مستند نہیں جانتے۔ لیکن ایران کا ملک الشعراء سنجر جب ہندوستان آیا تو مولانا بسمل کی شاعری کا ڈنکا بج رہا تھا۔ اسلئے سنجر اور بسمل میں ملاقات ہوئی اور بسمل کے کلام کو دیکھ کر وہ بے اختیار کہہ اٹھا:۔

"واللہ من بہتراز ونتوانم گفت"۔

اور سنجر نے جو کچھ کہا سچ کہا۔ بسمل کی تصانیف موجود ہیں۔ آپ شروع سے آخر تک مطالعہ کر جائیں کہیں کوئی لفظ، محاورہ اور بندش غیر ایرانی نظر نہیں آئے گی۔ اور یہ وہ کمال ہے جو کم کسی ہندی کو نصیب ہوا ہے۔

خاکسار کے ایک استاد تھے۔ بڑے فاضل اور شاعر۔ وہ یہ مانتے ہی نہیں تھے کہ بسمل ہندی ہے۔ اور مجھ سے بحث کرتے تھے کہ عبید اللہ بسمل تو ایرانی شاعر ہے۔ اور کہتے کہ میں نے ان کا کلام دیکھا ہوا ہے ہندی کبھی ایسا نہیں کہہ سکتا۔

اس خصوصیت کے علاوہ آپ کے کلام کی چند خصوصیات یہ ہیں:۔

اوّل۔ شعراء خصوصاً فارسی شعراء اپنے مفاخر بیان کرنے اور اپنی علمی برتری کا ذکر کرنے کو جائز سمجھتے ہیں۔ اور یجوز للشاعر مالا یجوز لغیرہٖ اس کی سند میں پیش کرتے ہیں۔ عُرفی کے قصائد اپنے ذاتی مفاخر میں آپ نے شاید دیکھے ہوں۔ یہی حال باقی شعراء کا ہے۔

لیکن اس کے بالکل برعکس بسمل کا کلام اول سے آخر تک خود ستائی سے پاک ہے ہزاروں اشعار میں کہیں ایک شعر بھی نہیں ملے گا جہاں آپنے کوئی فخریہ بات کہی ہو یہی نہیں بلکہ اس کے بالکل خلاف آپ کے اشعار میں عجز وانکسار۔ آہ و بکا۔ خود شکنی اور نفس کشی اور اپنی ہیچ مدانی اور ہیچ میرزی کا اعتراف جابجا نظر آئیگا ؎

ناموروناعار بدنام

ہر قدر پختہ آں قدر خام

اور آپ اُن کو ایک بالکل جُداگانہ روش پر گامزن دیکھیں گے۔ اخلاقی اعتبار سے یہ بہت ہی پیاری اور دلربا شعر گوئی آپ کو نظر آئیگی انسان بناوٹ سے بھی منکسر المزاج بن سکتا ہے لیکن یہاں یہ بات نہیں۔ بلکہ ان کا انکسار طبعی اور جبلی ہے۔ مثلاً قصیدہ نعتیہ میں کہتے ہیں ؎

خویش را در یثرب از ہندوستاں آوردہ ام

دوزخے را در بہشتِ جاوداں آوردہ ام

زرد روئی از ندامت روسیاہی از گناہ

طبلۂ مشک و نہ تنگِ زعفراں آوردہ ام

جرم بیروں از حساب و فسق افزوں از شمار

آنچہ کس نارد بدرگاہِ تو آں آوردہ ام

خام طبعے بسمت خوئے، ہجو بوئے بے عمل

تو دعوتِ ابیرم گدائے ناتواں آوردہ ام

اسی قسم کے سینکڑوں اشعار خود بینی کی بجائے خود شکنی کے متعلق آپ کو ملیں گے۔

دوم:۔ جیسا کہ اُوپر ذکر ہُوا۔ کثرتِ مطالعہ کی وجہ سے آپ کی نظر مذاہب عالم پر بسیط تھی۔ اور عربی اور فارسی علم ادب اور تاریخ پر عبور حاصل تھا۔ اس لئے آپ کے کلام میں جابجا تاریخی واقعات اور تلمیحات پائی جاتی ہیں۔

سوم:۔ بہت کم لوگ ہوتے ہیں۔ جو عربی اور فارسی دونوں زبانوں پر قدرت رکھتے ہوں لیکن بسمل جب فارسی شعر لکھتے ہیں۔ اور طبیعت کا رُخ پلٹتا ہے تو اسی زمین میں عربی اشعار بھی بے تکلف کہہ جاتے ہیں۔

چہارم:۔ بعض دفعہ آپ کی منطقی گرفت بہت سخت ہوتی ہے مثلاً بعض لوگ حضرت علی کو نعوذ باللہ خدا کا درجہ دیتے ہیں۔ اور علی اللّٰہی کہلاتے ہیں۔

بسمل فرماتے ہیں:۔

(ا) پُوبو طالب از خدا باشد

ابنِ ملجم بگو چہا باشد

(ب) اسی طرح بہائی لوگ بہاء اللہ کو خدا مانتے ہیں۔

بسمل فرماتے ہیں:۔

تو بہا را اگر خدا دانی

ناصر الدین را بہار خوانی

کیونکہ ناصر الدین شاہِ ایران نے بہاء اللہ کو

قید و بند میں ڈال دیا تھا۔

(ج) احمدیوں کو لوگ طنزاً میرزائی کہتے ہیں اور میرزا در اصل سردار زادہ کو کہتے ہیں۔ اس لئے بسمل اس لفظ کی حسنِ تعلیل میں فرماتے ہیں ؎

در غلامی میرزائی نام یافت
بندگیش خواجگی انعام یافت

یعنی مسیح موعود علیہ السلام کی غلامی اور خدمت گری کے طفیل غلام ہو کر امیر اور سردار کہلاتا ہوں۔

(د) عیسائیت رہبانیت سکھاتی ہے اور اسلام اہلی اور تمدنی زندگی کی تعلیم دیتا ہے فرماتے ہیں ؎

گفت عیسےٰ زِ خانہ دل بردار
گفت احمدؐ بہ خانہ دل بردار

(ہ) ایک شاعر نے احمدیت کے خلاف بہت کچھ زہر اگلا بسمل نے جواباً ایک قطعہ لکھا۔ اور ایک ایسا استادی کا ہاتھ مارا کہ باید و شاید ؎

عربدہ با ہوشیاراں از تنک ظرفی بود
بہر دائم نام کردی بادہ را ہشیار باش

(و) احرار کی شورش کے زمانے میں ۱۹۳۶ء کے قریب آپ نے تقریباً ڈیڑھ صد اشعار کی ایک نظم لکھی۔ اور فرمایا ؎

زمرۂ احرار را در مسلمانی کجا رست
ہست عتقاد رمیانِ شاں لشکر اہلِ ردد
زیرِ پا لرزد زمیں بالائے سر لرزد فلک
چوں دمد صورِ قیامت از فغانِ اہلِ درد

(ز) خدمتِ اسلام کی ضرورت کے متعلق فرماتے ہیں :-

شیخ قوم از خادمِ اسلام نیست
خنجرِ چوبیں است او صمصام نیست

طریقِ اصلاحِ شعر

آپ اپنے شاگردوں کا پورا اکرام بلکہ احترام فرماتے تھے۔ چونکہ طبیعت میں عجز و انکسار رچا ہوا تھا اسلئے شعر کی اصلاح میں بھی یہ بات نمایاں تھی۔ مثلاً غلط لفظ کو قلمزد نہیں فرماتے تھے بلکہ حاشیہ پر صحیح لفظ لکھتے اور فرماتے "مشورہ عرض ہے" نفسیاتی اعتبار سے اس میں شاگرد کی کس قدر دلداری اور حوصلہ افزائی ہے کہ اصلاح دہندہ کا یہ نقطۂ نظر ہے کہ اس کے نزدیک حاشیہ پر لکھا ہوا لفظ بہتر ہے۔ گو اسے اس پر ناز یا اصرار نہیں۔ یہ نہایت دلربا اور نیک طریق تھا۔

دوم۔ جو شعر عمدہ ہوتا اس کے کنارے پر ایک صاد (ص) لکھتے۔ اگر بہتر ہو تو دو صاد (صص)۔۔۔ اور اگر شعر بہترین ہو تو تین صاد (صصص) اور اگر شعر ہر لحاظ سے مکمل اور مضمون کو ختم کرنے والا ہو تو چار صاد (صصصص) لکھتے۔ اور بس۔

سوم۔ استادوں کی بابت سُنتے ہیں کہ ایک نقطے یا شوشے کی کمی بیشی سے کہیں کا کہیں پہنچا دیتے ہیں۔ اور در اصل یہ فنِ شعر اور زبان پر قدرت کا کمال ہوتا ہے۔ مثلاً مصرعہ تھا ع

دروغے چو کوہِ ہمالہ بزرگ

تو آپ نے اصلاح دی :-

دروغے زِ کوہِ ہمالہ بزرگ

ظاہر ہے کہ "جو" کی بجائے "زِ" کے لفظ نے
مضمون کو کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔ شعر تھا ؎

کہ یک بیذقے رشکِ فرزیں بُود
جہولے بہ بیں مفتیِ دیں بُود

اب ظاہر ہے کہ بہ بیں محض حشو ہے۔ آپ نے
بیں کو ایک شعشہ دیکر ہمیں بنا دیا اور مصرعہ
یوں بن گیا ؎

جہولے ہمیں مفتیِ دیں بُود

یعنی پرلے درجے کا جاہل پہلے درجے کا مفتی
بن بیٹھا ہے۔ ظاہر ہے کہ حشو نکل گیا اور مضمون
مکمل ہو گیا۔

چہارم۔ اصلاح کر کے نظم جب دیتے تو بڑے ادب
سے دونو ہاتھوں پر رکھ کر کھڑے ہو کر پیش
کرتے۔ کہ لیجئے یہ مشورہ سخن ہے۔ آپ کی
یہ انکساری دلوں کو موہ لینے والی تھی۔ دل اس
کا احساس رکھتا ہے لیکن زبانِ قلم اس کو
پورے طور پر ادا نہیں کر سکتی۔

سیرت آپ کی سیرت کا نمایاں اور ممتاز پہلو جو آپ
کی عملی زندگی میں اور تصانیف میں اُبھرا ہوا
نظر آتا ہے یہ ہے:-

اوّل۔ اگر آپ مسلسل کے ساتھ رہیں تو ان کی کسی بات
ان کی علمی فضیلت کا پتہ آپ کو نہ مل سکے گا۔
اہلِ محلہ بھی اس بات سے نا واقف تھے کہ ہمارے
پڑوس میں ایک بے نظیر شاعر اور متبحر عالم بستا
ہے۔ وجہ یہ کہ آپ کو نمائش اور ریا سے بعد

نفرت تھی ؎

بے تکلف، بے ریا، بے نفس، بے خود، بے غرض
مہربانے، دلنوازے، دوستدارے ایں چنیں
چشمِ من بسیار گردیدست و کم کم دیدہ است
ایں قدر عالی وقارے خاکسارے ایں چنیں
در ہمہ عالم نہ بینی جز بہ خاصانِ خدا
با چنیں طبعِ بلندے انکسارے ایں چنیں

دوم۔ دراصل اس قسم کا انکسار کامل علمی دستگاہ
کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ ورنہ کم ظرف آدمی
تھوڑے سے علم پر غرہ ہو جاتا ہے اور یہ بات
ترقی اور حصولِ کمال کے راستے میں بجائے خود
روک بن جاتی ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے ؎

فروتنی است دلیلِ رسیدگانِ کمال
کہ چوں سوار بہ منزل رسد پیادہ شود

اور جیسا کہ اوپر ذکر ہوا یہی وجہ ہے کہ آپ کے
کلام میں کہیں کوئی فخر کا اظہار نام کو بھی نہیں ملتا۔

سوم۔ شاعری کو لوگ ذریعۂ شکم پروری بناتے ہیں۔
کسی نے کہا ہے ؎

سہ چیز پیشہ بود شاعرانِ طامع را
یکے مدیح و دوم قطعہ تقاضائی
اگر بداد سوم شکر ورنہ دادِ ہجا
من ایں دو گفتہ ام اکنوں دگر چہ فرمائی

یعنی شاعر کا قاعدہ ہے کہ قصیدہ لکھے۔ انعام
نہ ملے تو تقاضا کے لئے قطعہ لکھے کچھ مل گیا تو
شکر ورنہ ہجو لکھنے سے شاعر نہیں چوکتا۔

آپ کا ذریعہ معاش طبابت یا ملازمت رہا۔
اس لئے آپ نے شعر سے کبھی کوئی نفع حاصل نہیں کیا
نہ ہی تصانیف سے کوئی فائدہ اٹھایا۔ بلکہ اکثر
کتابیں چھپوا کر مفت بانٹ دیتے باوجود کہ آپکی
مالی حالت اچھی نہ تھی۔ القصہ علم کے لئے علم کی
خدمت کرتے تھے نہ کہ کسی جلبِ منفعت کے لئے۔

آپ کی تصانیف

آپ کی تصنیفات دس کے قریب ہیں :-

اول۔ فارسی بول چال۔ یہ کتاب سکول کے مبتدیوں
کے لئے آپ نے لکھی اور بلوچستان کے
سکولوں میں عرصہ تک یہ کتاب ٹیکسٹ بک رہی۔

دوم۔ ترجمانِ پارسی۔ یہ بھی فارسی زبان کے قواعد
اور آداب سکھانے کے لئے ایک بہت
مفید کتاب ہے جس پر یونیورسٹی نے ۲۰۰ روپیہ
آپ کو انعام دیا۔ اور اس کے بعض حصے
فارسی کے کورسوں میں داخل ہوئے۔ یعنی
سرمایہ خرد ۔ پیرایہ خرد وغیرہ میں۔

سوم۔ ارجح المطالب۔ حضرت علیؓ کی سوانح حیات اور
مناقب میں ایک بے نظیر کتاب ہے۔ شیعہ ہونے
کی حالت میں آپ نے یہ کتاب لکھی اور ہندوستان
بھر میں اس کتاب کی وجہ سے مصنف کی شہرت
کو چار چاند لگ گئے۔ دیکھنے والی بات یہ ہے
کہ ایسا فدائی شیعہ کامل تحقیق کے بعد احمدی ہوگیا
اور لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ارجح المطالب
کا مؤلف ہو اور احمدی ہو جائے اور رامپور
کے لوگوں کے ظلم و ستم کو بخوشی برداشت کر لے۔
آپ خود فرماتے ہیں ؎

ے کشیدم من از ہرزہ کاری
پیش چشم جہانیاں خواری
جذبِ روح القدس مرا ناگاہ
مو کشاں برد سوئے روح اللہ
گشتم از کارِ بخت خود بس شاد
کہ بدستِ مسیح دستم داد

چہارم۔ مسدس مد و جزرِ اسلام سنہ ۱۹۰۱ء میں طبع ہوئی
یہ وہ زمانہ ہے جب مسدسِ حالی کی اشاعت
ہوئی اور مسلمانوں کے عروج کے بعد ان کے
زوال کا نوحہ حالی نے پڑھا۔
اسی مضمون پر فارسی میں بسمل نے قلم اٹھایا۔
اور حق بات یہ ہے کہ اس مضمون کا پورا حق ادا
کیا۔ اس مسدس کے ۱۳۶ بند یعنی ۸۱۶ اشعار
ہیں۔ ہر شعر بے بدل ہے۔ طرزِ کلام یہ ہے ؎

یاد آیا ہے کہ قلزم تن بہ طوفاں دادہ بود
زورقِ دریا بگردابِ بلا افتادہ بود
ہم جہازِ اہلِ جرأت برکنار استادہ بود
تا اگر یک از خود خیزد بغرق آمادہ بود
حسبنا اللہ گفتہ ما کشتی بآب انداختیم
حسبۃً للہ بکارِ این و آں پرداختیم

یہ تو اس مسدس کا پہلا بند ہے مسلمانوں کے عروج
کا نقشہ ایک بند میں یوں کھینچا ہے
؎

بزمِ ما در بلخ بُود و رزمِ ما در خاوراں
تاجِ ما در مصر بُود و تختِ ما در اصفہاں
پیلِ ما در ہند بُود و رخشِ ما در سیستاں
تیغِ ما در سند بُود و نیزہ در مازندراں
دشتِ موسیٰ گاہ میلرزید از غوغائے ما
کوہِ آدم گاہ سر مے سُود زیرِ پائے ما

اور اس کے بعد زوال کا نقشہ یوں ہے ؎

حُبِّ قوم و رحمِ خویشاوند و مہرِ دوستاں
جوشِ غیرت، پاسِ عزت، آبروئے دودماں
دردِ ملت، صدقِ نیت، حفظِ وضعِ خانداں
زیں فضائل ہم نیابی در گروہِ ما نشاں
ایکہ در عالم بگشتی ہم چو دیدستی شگفت
رختِ ما را دُزد بُرد و خانہ را آتش گرفت

یعنی یہ نادرہ کاری تمام جہانوں میں نہ ملے گی کہ چور تو سارا سامان لُوٹ کر لے گئے اور پھر گھر کو آگ بھی لگ گئی۔ یعنی دنیوی اور دینی اقدار سب جاتی رہیں۔

غرضیکہ مسدس بسمل ایک نہایت فاضلانہ نظم ہے جو جا بجا تاریخی واقعات سے مملو ہے اور بلاغت اور زورِ کلام کا ایک مثالی شاہکار ہے۔

پنجم۔ مرآت اسلام۔ ایک عالی قدر نظم ہے مضمون نام سے ظاہر ہے۔

ششم۔ خاتم النبیینؐ۔ مثنوی ہے جس میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت بیان کی گئی ہے اور علاوہ ازیں آپ کی ہر زوجہ مطہرہ کے اوصاف و مناقب نظم کیے ہیں۔ اس میں آپ نے یہ پابندی رکھی ہے کہ ہر مضمون کے بعد ممدوح یعنی ہر اُمّ المومنینؓ سے درخواست کرتے ہیں کہ بسمل کی مغفرت کے لیے خدا تعالیٰ کے حضور سفارش کریں۔ مثلاً ؎

اُمّنا گرچہ من گنہگارم
لیک از فضلِ تو رجا دارم
کہ بروزِ جزا ز بطشِ خدا
وا رہانی غلامکِ خود را

اس کے بعد خلفائے راشدینؓ، حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور حضرت خلیفۃ المسیح اوّلؓ اور حضرت خلیفۃ المسیح ثانی اور قادیان کی مدح و توصیف میں عالی قدر مضمون نظم کیے ہیں۔

ہفتم۔ حیاتِ بسمل۔ مثنوی ہے۔ انسانی زندگی کے مختلف پہلو منظوم کیے گئے ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے۔ مناجات میں کہتے ہیں ؎

اے خدا گرچہ عذرِ من لنگ است
نالہ ام نیز خارج آہنگ است
دستِ موسیٰ ز تو نمے خواہم
دمِ عیسیٰ ز تو نمے خواہم
لحنِ داؤد ہم نمے خواہم
معجزِ ہود ہم نمے خواہم
صبرِ ایوب ہم نمے خواہم
حُزنِ یعقوب ہم نمے خواہم

ملک داری زِتو نے خواہم
شہر یاری زِتو نے خواہم
تاجِ شاہی زِتو نے خواہم
کجکلاہی زِتو نے خواہم
تختِ طاؤس را نے خواہم
بختِ کاؤس را نے خواہم
جامِ جمشید ہم نے خواہم
طشتِ خورشید ہم نے خواہم
جاہِ کیخسروی نے خواہم
مملکتِ کسروی نے خواہم
صولتِ سنجری نے خواہم
دولتِ اکبری نے خواہم
من بدخشاں زِتو نے خواہم
بحرِ عمّاں زِتو نے خواہم
ہند و سند و عرب نے خواہم
مصر و شام و حلب نے خواہم
آسمان و زمیں نے خواہم
از تو عرشِ بریں نے خواہم
از تو خواہم کہ یارِ من باشی
مونسِ جانِ زارِ من باشی
وقتِ مُردن بیادِ من آئی
دردِ دلِ بے مرادِ من آئی
از بدن چوں رواں رواں گردد
نامِ پاکِ تو در دہاں گردد
للہ الحمد بر زباں باشد ، حسبی اللہ وِردِ جاں باشد

اشعارِ مذکورہ سے قدرتِ کلام، علمِ قافیہ پر کامل دستگاہ اور مصنف کی زندگی کا مقصود ظاہر ہے۔ اشعار کیا ہیں ایک اُمڈا ہوا دریا ہے۔

ہشتم۔ حق الیقین فی معنیٔ خاتم النبیین۔ اُردو نثر میں ہے۔ لفظ خاتم النبیین پر بڑی سیر حاصل صرفی، نحوی اور منطقی بحث ہے۔ بہت لاجواب کتاب ہے۔

نہم۔ قصیدہ نعتیہ۔ ۱۹۷ اشعار ہیں۔ رنگِ سخن یہ ہے۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق عرض کرتے ہیں ؎

در فقیری شہریارے سرورے پیغمبرے
داورِ منبر نشینے دارالنشاں آوردہ ام
گر بگوئی برترش از دیگراں آوردہ ام
بے گماں آوردہ ام بے شبہ ہاں آوردہ ام

آوردہ ام متکلم کی ردیف اختیار کر کے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و اوصاف، سیرت و تعلیم اس قصیدے میں بیان کرنا ایک کمال ہے۔ خاقانی کا ایک قصیدہ اسی زمین میں موجود ہے۔

دہم۔ قندِ پارس۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں خاکسار کی درخواست پر یہ مثنوی آپ نے لکھی۔ اور آپ کے وصال کے بعد طبع ہوئی۔ نمونۂ کلام یہ ہے اور سو سال کی عمر میں یہ زورِ کلام ہے ؎

باز بسمل از رہِ فرزانگی
رفت یاراں بر سرِ دیوانگی

وہ چہ گویم از خرد بیگانہ شد
مست شد بد مست شد دیوانہ شد
عاشقی بر خویشتن بندد ہمے
یک جہاں بر کارِ او خندد ہمے

پھر کتنے پتے کی کہتے ہیں ؎

شیخِ قوم از خادمِ اسلام نیست
خنجرِ چوبیں است او صمصام نیست

یازدہم ۔ مختلف اوقات میں آپ نے جو قصائد اور نظمیں لکھیں ان کا ایک مسودہ خاکسار کو مل گیا تھا۔ باقیاتِ بسملؔ کے نام سے میرے پاس موجود ہے۔

دوازدہم ۔ کشتیٔ نوح کا فارسی ترجمہ آپ نے کیا تھا کسی دوست کے پاس موجود ہے۔ مجھے باوجود کوشش نہیں مل سکا۔

سیزدہم ۔ حضرت مسیح موعودؑ کی کتاب تذکرۃ الشہادتین کا ترجمہ حضورؑ کے زمانہ میں ہی بسملؔ نے کیا۔

غرضیکہ بسملؔ مرحوم ۔ علم وفضل کے آفتاب ۔ فنِ شعر میں کامل ۔ اخلاقی اعتبار سے پیکرِ انکسار ۔ بے غرض ۔ دُور بخدا ۔ احمدیت کے دلدادہ ۔ جہاں استاد ۔ شہرت سے نفور اور ایسے عاجز طبع کہ خود ہماری جماعت میں بھی بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ ہم میں ایک ایسا استادِ فن اور باکمال شخص ہوا ہے جس کا بدل ہندوستان میں گزشتہ صدی میں کوئی نظر نہیں آتا ۔ سو سال کی عمر پائی اور مقبرہ بہشتی میں تربت گزین ہوئے یعنی ۱۹۳۹ء میں۔

مَیں نے یہ نہایت مختصر واقعات آپ کے بارے میں عرض کئے ہیں۔

شیخنا جانِ من و جانِ شما
اللہ اللہ رفعتِ شانِ شما
مرحبا آں علم وفضل و اقتدار
حبذا آں حلم و عجز و انکسار
مقبرِ محزون چشم خونفشاں
یادِ تاں آرد کہ دارد یادِ تاں
تو زیاراں یاد مے آری کہ نے
تو زیاراں یاد مے آری کہ نے
جستجو کردم بعالم کو بکو
نغز گو مثلِ عبید اللہ کو
من کہ صد سودا و بحر داشتم
دیدہ باز خوابِ او بر داشتم
تا سواد از بسملؔ الا گرفت
کالِ نظم ایں چنیں بالا گرفت
یادِ او در حضرتِ ربّ الانام
شاد مند و شاد بہرو شاد کام

اور میری اس تمام تقریر سے غرض یہ ہے کہ ہم اپنے علماء کی یاد کو تازہ رکھیں۔ اور ان کے اخلاقی اور علمی نمونوں کی پیروی کریں اور احمدی علمی میدانوں میں سب سے آگے رہیں۔ کیونکہ حصولِ علم کے لئے جو مواقع اور سہولتیں ہمیں حاصل ہیں وہ دوسروں کو میسر نہیں۔

واللہ الموفّق ؎

سیرت صدیق اکبرؓ کا ایک پہلو

ہجرت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمسفر

ثَانِیَ اثْنَیْنِ

(جناب چودھری غلام احمد خان صاحب ایڈووکیٹ پاکپتن)

اسلام کے ابتدائی تیرہ سالوں میں مشرکین اور کفار مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ پر ہر قسم کے جور و ستم اور مظالم ڈھاتے رہے۔ کفار نے مسلمانوں کی ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ چنانچہ ان سے تنگ آکر بعض صحابہ کرامؓ حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے اور پھر بعض یثرب کی طرف۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کے لئے مکہ سے باہر چلے گئے تھے مگر ایک سردار ابن دغنہ آپ کو مکہ میں واپس لے آیا۔ اور اس نے کہا کہ (اے ابوبکر) تمہارے جیسا آدمی نہ نکل سکتا ہے اور نہ نکالا جا سکتا ہے۔ کیونکہ تم ثواب کماتے ہو۔ عزیزوں کے ساتھ سلوک کرتے ہو۔ اور بے کسوں کی کفالت کرتے ہو اور مہمان کی مہمان داری کرتے ہو اور راہِ حق میں جو مصائب کسی کو پہنچیں تم ان کی اعانت کرتے ہو۔ میں تمہارا حامی ہوں تم لوٹ چلو۔ اور اپنے ہی شہر میں رہ کر اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔ چنانچہ قریش مکہ نے ابن دغنہ کی امان کا انکار نہ کیا۔

اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے چند دنوں تک اپنے گھر کے اندر ہی عبادتِ الٰہی اور تلاوتِ قرآن مجید کی۔ پھر اپنے مکان کے سامنے ایک تھڑا بطور مسجد بنا لیا۔ وہاں عبادتِ الٰہی کرتے اور تلاوتِ قرآن مجید کرتے اور قریش پر اس کا اثر ہوتا۔ مخالفین کو یہ بات پسند نہ تھی انہوں نے ابن دغنہ کو بلا بھیجا اور اسے کہا۔ کہ ہم نے ابوبکر کو تمہارے کہنے پر امان دی تھی لیکن وہ تو علانیہ طور پر باہر مسجد میں عبادتِ الٰہی کرتے ہیں اور قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں۔ ہمیں اس سے خوف ہے ابن دغنہ نے کہا کہ میں ابوبکر کے پاس جاتا ہوں اور اس سے اس کو منع کرتا ہوں۔ جب وہ آپ کو منع کرنے آیا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس کو جواب دیا کہ میں تیری امان تجھے واپس کرتا ہوں اور میں صرف اللہ تعالیٰ کی امان پر راضی ہوں۔

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے فرمایا کہ مجھے (خواب میں) تمہاری ہجرت کا مقام دکھایا گیا ہے۔ اس میں کھجور کے درخت ہیں۔ دو سنگستانوں کے درمیان میں ہے۔ اس پر اکثر وہ لوگ جنہوں نے حبشہ

کی طرف ہجرت کی تھی۔ مدینہ میں لوٹ آئے اور حضرت
ابوبکر صدیق رضؓ نے بھی مدینہ کی تیاری کی تو آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ ٹھہر جاؤ، امید ہے مجھے بھی
اجازت مل جائے گی۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا میرا باپ
اور میری ماں آپ پر فدا ہو جائے۔ کیا آپ کو اس کی
امید ہے۔ آپؐ نے فرمایا "ہاں"۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ
نے اپنے آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کے لئے
روک لیا اور دو اونٹنیوں کو جو اُن کے پاس تھیں چار
مہینے تک درختوں کے پتے چرائے۔ پھر ایک دن
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوپہر کے وقت حضرت ابوبکرؓ
کے گھر تشریف لائے۔ اس وقت آپؐ نے اپنے سر پر
چادر ڈالی ہوئی تھی۔ اور آپؐ نے اجازت طلب کی تو
آپؐ کو اجازت دی گئی۔ آپؐ اندر تشریف لائے اور
فرمایا کہ جو لوگ تمہارے پاس ہوں اُن کو ہٹا دو۔ اس پر
حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی کہ یہاں میرے گھر والوں کے
سوا اور کوئی نہیں۔ تو آپؐ نے فرمایا "سنو! اللہ تعالیٰ
نے مجھے ہجرت کی اجازت دیدی ہے۔ اس پر حضرت
ابوبکرؓ نے عرض کی۔ یا رسول اللہ! میرا باپ آپ پر
فدا ہو مجھے بھی رفاقت میں لیجئے گا؟ آپؐ نے فرمایا۔
"ہاں"۔ ابوبکرؓ نے عرض کی تو پھر میری ان دو اونٹنیوں
میں سے ایک آپ لے لیجئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا "ہم تو بقیمت لیں گے"۔ حضرت عائشہؓ کہتی
ہیں۔ کہ پھر ہم انہیں بہت سرعت کے ساتھ تیار کرنے
لگے۔ ہم نے دونوں کے لئے ایک چمڑے کی تھیلی میں کچھ ناشتہ
رکھ دیا۔ اور اسماءؓ بنت ابوبکرؓ نے اپنے کمر بند کا ایک
ٹکڑا کاٹ کر اس سے تھیلے کا منہ باندھ دیا۔ اسی وجہ
سے ان کا نام ذات النطاقین رکھا گیا۔ (ملخص از
تجرید البخاری حصہ دوم باب ہجرت ص۲۲۲ تا ص۲۲۸)

مذکورہ بالا اقتباس حدیث سے صاف عیاں ہے
کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مدت پہلے سے
حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب بطور رفیقِ سفر ہجرت کیا ہوا
تھا اور آنحضورؐ کو آپ پر کامل اعتبار اور اعتماد تھا۔
اور آپ کو صحابہ کرامؓ میں سب سے زیادہ بہادر اور
شجاع اور جاں نثار اور متقی سمجھتے تھے۔ اور جانتے تھے
کہ مالی اور جانی قربانی میں یہ مردِ خدا اور رجل یسعیٰ
ہے۔ عجیب بات ہے کہ ہجرت کی رازدارانہ گفتگو
اور پھر تیاری بھی اسی مردِ خدا کے گھر میں ہوتی ہے۔
اور یہ مردِ خدا بھی ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر اپنا گھر بار، مال و دولت اور
تجارت اور کاروبار اور وطن سب کچھ فوراً چھوڑنے
کے لئے تیار ہو گیا اور دل میں کوئی ہچکچاہٹ اور
تذبذب پیدا نہیں کیا۔ بلکہ بہ طیبِ خاطر آنحضور صلی اللہ
علیہ وسلم کا ساتھ دینے کو فوراً تیار ہو گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت بخوشی خود نہ
کی تھی۔ بلکہ ظالم قریش نے آپؐ کو قتل کر ڈالنے کا
منصوبہ کیا ہوا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اُن کے
بد ارادے سے اطلاع دیدی تھی۔ اور پھر آپؐ کو
ہجرت کی اجازت دی تھی۔ جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا:۔

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ

صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صاحب ابوبکرؓ کو کہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صاحب یعنی ساتھی اور رفیق ہونے کا دلکش خطاب عطا فرمایا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ساتھ اور رفاقت اور صحبت تمام عمر اخیر تک نبھائی بلکہ مرنے کے بعد بھی ایک ہی مقام پر مدفن موجود ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے خطاب کی برکت ہے۔

(۵) لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کو کہتے تھے کہ غم مت کر، اللہ تعالیٰ ہم دونوں کے ساتھ ہے کہ خدا یاماست۔ (عبرانی میں عمانوایل) یہ اسوقت کی بات ہے جبکہ قریش مکہ اور ان کے کھوجی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ دونوں کی تلاش کرتے ہوئے اور کھوج نکالتے ہوئے عین غار ثور کے منہ کے قریب پہنچ گئے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کو ان کے پاؤں نظر آرہے تھے۔ اور اسوقت وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ یا تو وہ اس غار میں ہیں اور یا پھر آسمان پر چلے گئے ہیں۔ اسوقت حضرت ابوبکر صدیقؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کا غم ہوا کہ اگر انہوں نے غار میں جھانک کر دیکھا تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گرفتار کر لیں گے اور قتل کر ڈالیں گے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کے اس ڈر کو بھانپ کر فرمایا تھا۔ لا تحزن ان اللہ معنا یعنی غم کیوں کرتا ہے خدا یاماست۔ اللہ تعالیٰ کو حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ غم اسقدر پسند آیا کہ قرآن مجید میں اس کا بیان کرنا ضروری سمجھا لیکن ایک وہ لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ پر اسوقت خوف طاری ہو گیا تھا اور وہ کانپ رہے تھے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ اللہ تعالیٰ تھا اسلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ خلیفہ اوّل بھی ہو گئے تھے۔

(۶) فَاَنْزَلَ اللّٰہُ سَکِیْنَتَہٗ عَلَیْہِ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مذکورہ غم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ قول کہ غم مت کر خدا یاماست کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ پر سکینت اور تسلّی نازل کی اور غم کافور ہو گیا۔ کیا خوف اور کیا کانپنا۔ اور محض اللہ تعالیٰ کا فعل اور فضل تھا۔ اس مخصوص فضلِ الٰہی میں کوئی اور صحابی شریک نہیں۔ اس کو فضیلت کہتے ہیں۔

(۷) وَاَیَّدَہٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْھَا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اسکی (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ بوجہ فنا فی الرسول ہونیکے ایک ہی وجود کا حکم رکھتے تھے) ایسے لشکروں سے تائید کی جن کو تم نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اسوقت اپنے فرشتوں کے لشکر بھیجدیئے۔ وہ فرشتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ کے اطمینانِ قلوب کا باعث ہوئے۔ دوسری طرف قریش مکہ اور کھوجیوں کو غارِ ثور کے اندر جھانک

دو آدمی نہیں صرف ایک آدمی ہے تو قدرتی طور پر ان کو خیال آتا کہ یہ دونوں میں سے کونسا آدمی ہے آیا ہمارا شکار محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے یا علیؓ ہے۔ چنانچہ واقعہ ایسا ہی ہوا کہ حملہ آوروں نے اندھا دھند حملہ نہیں کیا۔ جب اُن کو معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو مکان سے نکل چکے ہیں اور مکان کے اندر حضرت علیؓ موجود ہیں تو انہوں نے اُن پر حملہ کرنے سے اپنے ہاتھ پیچھے ہٹا لیے۔ چنانچہ حضرت علیؓ پر کوئی وار نہ ہوا۔ اسلئے آپ مضروب نہ ہوئے۔ اس بات کو حضرت علیؓ بھی بخوبی سمجھتے تھے اسلئے وہ بھی مطمئن ہو کر بستر پر لیٹ گئے۔ بالفرض حضرت علیؓ کو کوئی خطرہ تھا تو بھی بہرحال آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم دربارہ ادائیگی امانت ہائے بجا لانا تھا۔ الامر فوق الادب۔ ہم حضرت علیؓ کی اس قربانی کو نہایت قدر کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ کی قربانی پر اسے فضیلت دینے کا کونسا امر نکلتا ہے۔ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو اپنے بستر پر لیٹ جانے اور پھر امانت ہائے کو واپس کرنے کا حکم دیا تھا جو کہ وہ بجا نہ لائے اور حضرت علیؓ بجا لائے۔ اگر ایسا ہوتا تو بے شک فضیلت کا قیاس کیا جا سکتا تھا مگر ایسا نہیں ہوا اسلئے فضیلت کا نتیجہ نکالنا بے سود ہے۔

علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؓ کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر لیٹنے اور چادر اوڑھنے والے واقعہ کو قرآن مجید میں بیان نہیں فرمایا بلکہ حدیث میں بھی بعض راویوں نے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ البتہ تم تاریخی طور پر اس کو درست اور صحیح سمجھتے ہیں۔ پس اس سے اس واقعہ کی اہمیت معلوم ہو جاتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہجرت میں اور خصوصاً غارِ ثور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق ہونے کا ذکر قرآن مجید میں خصوصیت سے کیا ہے۔ اور چار و ناچار معترضین کو بھی یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے۔ اس سے واقعہ ثور کی اہمیت اظہر من الشمس ہے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی سعادت اور فضیلت بھی ظاہر ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ
اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ
اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ
اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ
سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ
بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ
كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى
وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ
وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (التوبہ ع)

ترجمہ: (اے مومنو!) اگر تم اس کو (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو) مدد نہ دو گے تو اللہ تعالیٰ نے یقیناً اس کی نصرت کی جب انہوں نے جو کافر ہوئے اس کو نکال دیا دو تو میں سے دوسرا جب وہ دونوں غار میں تھے

جب وہ اپنے رفیق کو کہتا تھا مت غم کھا یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس پر اپنی تسکین اتاری اور اس کی ان لشکروں سے تائید کی کہ جن کو تم نے نہ دیکھا تھا۔ اور اس نے ان لوگوں کی بات جو کافر ہوئے تھے نیچی کر دی اور اللہ تعالیٰ کا ہی بول بالا ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ :-

(۱) اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے مومنو! ہم نے محمد رسول اللہ کی مدد اور نصرت کی تھی جبکہ وہ بوقتِ ہجرت اپنے گھر سے نکل رہا تھا۔ گھر سے نکلنے کے وقت وہ اکیلا ہی نکلا تھا اور محاصرہ کرنے والے لوگ اس کو دیکھ نہ سکے، یا معلوم نہ کر سکے۔ یا شناخت نہ کر سکے۔ بہرحال اس وقت محض نصرت الٰہی ہی کام آئی تھی۔ جبکہ وہ لوگ آپ کو پکڑ نہ سکے۔ اور یہ نہایت نازک وقت تھا۔ اسوقت کسی مومن کی مدد اور نصرت بھی کسی کام نہ آسکتی تھی۔ اور نہ آئی۔

(۲) ثَانِيَ اثْنَيْنِ ۔ دونوں میں سے دوسرا۔ غارِ ثور میں چھپنے والے ایک تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور دوسرے حضرت ابوبکر صدیق رضؓ تھے۔ اسلئے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ثانی اثنین کی خلعت سے نوازا۔ اسنا کو یہ مخصوص لقب بخشا جس میں کوئی دوسرا صحابی شریک نہیں۔ فضیلت اسے کہتے ہیں۔

(۳) اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ ۔ جب وہ دونوں غار میں تھے۔ یعنی یارِ غار تھے۔ یہ مسلم ہے کہ غارِ ثور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے سوا کوئی اور صحابی نہیں تھا۔ اس ابتلاء اور مصیبت اور تکلیف کے وقت حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کرنا اور ساتھ دینا یقیناً آپ کی دلیری، بہادری، شجاعت اور تقویٰ و طہارت اور اخلاص و محبت، اور جانبازی اور جاں نثاری وغیرہ اعلیٰ اخلاق کی بین دلیل ہے۔ کیونکہ اسوقت قریشِ مکہ عام اعلان کر چکے تھے کہ جو کوئی حضرت محمد یا حضرت ابوبکر رضؓ کو پکڑ کر لائے یا قتل کر کے ان کا سر کاٹ کر لائے تو ہر ایک سر کے عوض میں سو سو اونٹ بطور انعام پائے گا۔ چنانچہ سراقہ بن جعشم نے بعد ازاں اسی انعام کے لالچ میں ساحل سمندر پر ان کا تعاقب کیا تھا۔ حضرت علی رضؓ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر لیٹنے کا واقعہ اس جانکاہ واقعہ سے نسبت ہی کیا رکھتا ہے۔ حضرت علی رضؓ کو کوئی قتل نہ کرنا چاہتا تھا اور یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے سر دھڑ کی بازی لگی ہوئی تھی۔

(۴) اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ ۔ یعنی جب آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صاحب ابوبکرؓ کو کہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صاحب یعنی ساتھی اور رفیق ہونے کا دلکش خطاب عطا فرمایا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ساتھ اور رفاقت اور صحبت تمام عمر اخیر تک نبھائی بلکہ مرنے کے بعد بھی ایک ہی مقام پر مدفن موجود ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے خطاب کی برکت ہے۔

(۵) لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کو کہتے تھے کہ غم مت کر، اللہ تعالیٰ ہم دونوں کے ساتھ ہے کہ خدا با ماست۔ (عبرانی میں عمانوایل) یہ اسوقت کی بات ہے جبکہ قریش مکہ اور ان کے کھوجی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ دونوں کی تلاش کرتے ہوئے اور کھوج نکالتے ہوئے عین غارِ ثور کے منہ کے قریب پہنچ گئے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کو ان کے پاؤں نظر آرہے تھے۔ اور اسوقت وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ یا تو وہ اس غار میں ہیں اور یا پھر آسمان پر چلے گئے ہیں۔ اسوقت حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کا غم ہوا کہ اگر انہوں نے غار میں جھانک کر دیکھا تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گرفتار کرلیں گے اور قتل کر ڈالیں گے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کے اس ڈر کو بھانپ کر فرمایا تھا۔ لا تحزن ان اللہ معنا یعنی غم مکن کہ خدا با ماست۔ اللہ تعالیٰ کو حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کا یہ غم اسقدر پسند آیا کہ قرآن مجید میں اس کا بیان کرنا ضروری سمجھا لیکن ایک وہ لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ پر اسوقت خوف طاری ہوگیا تھا اور وہ کانپ رہے تھے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ اللہ تعالیٰ تھا اسلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ خلیفہ اول بھی ہوگئے تھے۔

(۶) فَاَنْزَلَ اللّٰہُ سَکِیْنَتَہٗ عَلَیْہِ۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے مذکورہ غم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ قول کہ غم مت کر خدا با ماست کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ پر سکینت اور تسلی نازل کی اور غم کافور ہوگیا۔ کیا خوف اور کیا کانپنا۔ اور محض اللہ تعالیٰ کا فعل اور فضل تھا۔ اس مخصوص فضلِ الٰہی میں کوئی اور صحابی شریک نہیں۔ اس کو فضیلت کہتے ہیں۔

(۷) وَاَیَّدَہٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْھَا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اسکی (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ بوجہ فنافی الرسول ہونیکے ایک ہی وجود کا حکم رکھتے تھے) ایسے لشکروں سے تائید کی جن کو تم نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اسوقت اپنے فرشتوں کے لشکر بھیجدیئے۔ وہ فرشتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ کے اطمینانِ قلوب کا باعث ہوئے۔ دوسری طرف قریش مکہ اور کھوجیوں کو غارِ ثور کے اندر جھانک کر

دیکھنے سے مانع ہوئے۔ یونہی بے نیل مرام واپس لوٹ
گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت
ابوبکر صدیق رضی کو خلیفۃ الرسول بنانے کیلئے بھی فرشتوں
کے ایسے ہی لشکر اندر ہی اندر تحریک کر رہے تھے اور یہ
بھی اللہ تعالیٰ کا خاص فضل حضرت ابوبکر رضی پر ثابت ہے
جس میں کوئی اور صحابی شریک نہیں۔

(۸) وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ۔ اور
کافر جو کہتے تھے ان کی بات کو نیچا کر دکھایا۔ کافروں
کا منصوبہ تو یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یا تو
قید کر دیا جائے یا قتل کر دیا جائے لیکن اللہ تعالیٰ
نے کافروں کے منصوبے کو پورا ہونے نہ دیا۔ حالانکہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی کے زندہ
گرفتار کرنے یا انہیں شہید کر کے سر کاٹ کر لانے پر
سو سو اونٹ کا انعام بھی مقرر تھا۔ اور کوئی کافر یہ
انعام بھی حاصل نہ کر سکا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی پر بھی یہ اللہ تعالیٰ کا فضل
وکرم رہا۔

(۹) وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا۔ یعنی اللہ تعالیٰ
کا بول ہی بالا ہوتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا تھا وَيَمْكُرُونَ
وَيَمْكُرُ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ۝ قریش
مکہ آنحضرت کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ اسلئے وہ پوشیدہ
تدبیریں کرتے تھے۔ کبھی گھر کا محاصرہ کیا اور کبھی غارِ
ثور کے منہ تک پہنچے تاکہ آنحضور کو قتل کر کے سو
اونٹ انعام پاویں۔ اور آپ کے رفیق ابوبکر رضی کو
بھی گرفتار کر کے اور قتل کر کے اور سو اونٹ کا
انعام حاصل کریں۔ وہ اپنے اس منصوبے میں بری
طرح ناکام رہے۔ کیونکہ ان کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ
بھی تدبیر کرتا تھا کہ وہ دونو نجات پاویں۔ چنانچہ ان
دونو نے اللہ تعالیٰ کے فضل ورحم سے نجات پائی۔
اسلئے ثابت ہوا کہ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ۔ کہ
اللہ تعالیٰ سب تدبیر کرنے والوں سے بہتر تدبیر
کرنے والا ہے۔

(۱۰) وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ اور اللہ تعالیٰ زبردست
دانا اور حکیم ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی غالب رہتا ہے چنانچہ
قریش مکہ بہتیرے ہاتھ پاؤں مار چکے لیکن خدائے عزیز
اور حکیم کے مقابلہ میں وہ ناکام ہو کر رہ گئے اور آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی کا بال بیکا نہ کر سکے۔
وہ اس مصیبت اور ابتلاءِ عظیم سے نجات پا گئے۔
الحمد للہ رب العالمین۔

مذکورہ بالا آیات پر تدبر اور غور کرنے سے ثابت ہے کہ
حضرت علی رضی کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر لیٹنے والا
واقعہ ایسا اہم نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کا قرآن کریم میں ذکر کرتا۔
البتہ غارِ ثور والا واقعہ ایسا اہم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا
قرآن کریم میں ذکر کرنا مناسب سمجھا۔ اس سے فضیلت حضرت
ابوبکر صدیق رضی ظاہر ہے۔ اور جن صفات سے ان آیات میں
حضرت ابوبکر صدیق رضی کی تعریف کی گئی ہے قرآن کریم میں ان
صفات سے کسی اور صحابی کی تعریف نہیں کی گئی۔ آپ کو
"ثانی اثنین" اور "صاحب" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
نام سے پکارا گیا۔ اور آپ کو بفضل ان اللہ معنا میں شریک
کیا گیا۔ بوقتِ غم آپ پر سکینت نازل کی گئی۔ اور پھر فرشتوں سے

آپ کی مدد کی گئی۔ اور کافرین کے نامراد رہنے اور اللہ تعالیٰ
کے غالب ہونے کے نشانات میں آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کے ساتھ شریک کیا گیا۔ گویا آپ فنافی الرسول اور فنافی اللہ
ثابت ہوئے۔ اسی لئے اور اسی طریق پر اللہ تعالیٰ نے اپنی
تائید و نصرت سے آپ کو بعد وفاتِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
خلیفہ اوّل مقرر فرمایا۔

قبل ازیں بیان ہو چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
سفرِ ہجرت کی تمام تیاری حضرت ابوبکر صدیقؓ کے گھر میں ہوئی
اور اب غارِ ثور میں عبداللہ بن ابوبکرؓ رات کے اندھیرے میں
آجاتے اور قریش مکہ کے تمام حالات بیان کر جاتے اور دن
کے وقت قریشِ مکہ میں پھرتے رہتے اور حالات معلوم کرتے
رہتے۔ اسی طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ کا خادم عامر بن فہیرہ
تمام دن غارِ ثور سے کسی قدر دور بکریاں چراتا رہتا اور موقعہ
پاکر غارِ ثور میں بکریوں کا دودھ پہنچاتا رہتا خصوصاً رات کے
اندھیرے میں۔ بالآخر ایک رات عبداللہ بن ابوبکرؓ نے
اطلاع دی کہ اب قریش تھک کر بیٹھ گئے ہیں اور تلاش
ترک کر دی ہے اور تعاقب چھوڑ دیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ
نے عبداللہ بن اریقط کو اجرت پر رہنما مقرر کر رکھا تھا اور
مقرر تھا کہ فلاں رات اور فلاں وقت دونوں اونٹنیاں غارِ
ثور پر لے آنا۔ یہ شخص غیر مسلم تھا لیکن قابلِ اعتبار ضرور تھا۔
چنانچہ چوتھے دن رات کے وقت وہ اونٹنیاں لے آیا اور
۲۰ جون ۶۲۲ء مطابق ۴ ربیع الاول ۱۴ سنہ نبوی
کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور یہ راہبر القصویٰ ایک اونٹنی
پر سوار ہوئے اور حضرت ابوبکرؓ اور آپ کا خادم عامر بن
فہیرہ دوسری اونٹنی پر سوار ہوئے اور ساحل سمندر کی طرف
جا کر وہاں سے یثرب کی طرف چل پڑے۔ ایک دن اور
ایک رات۔ اور دوسرے دن جب دوپہر کے وقت دھوپ
تیز ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی
خدمت میں عرض کی کہ آپ ایک بڑے پتھر کے سایہ میں آرام
کر لیں اور میں پہرہ دوں گا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے حضرت ابوبکرؓ کی یہ بات مان لی اور آپ پتھر کے سایہ
میں لیٹ گئے اور سو گئے اور حضرت ابوبکرؓ پہرہ دے
رہے تھے کہ اتنے میں ایک شخص بکریاں چراتا ہوا نظر آیا۔
حضرت ابوبکرؓ نے اس چرواہے سے دودھ لیا اور پانی
میں ٹھنڈا کر کے حضورؐ کو جاگنے پر پلایا۔ جب دھوپ کم
ہوئی تو پھر چل پڑے۔ اس وقت حضرت ابوبکرؓ نے دیکھا
کہ کوئی شخص سرپٹ گھوڑا دوڑائے چلا آرہا ہے۔
یہ سراقہ بن مالک یا سراقہ بن جعشم تھا جو کہ دو سو اونٹ
کا انعام حاصل کرنے کے لئے دوڑا آرہا تھا۔ اس نے
دو تین دفعہ فال نکالی اور دو تین دفعہ ہی گھوڑا زمین میں
دھنس گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اس کی طرف
مڑ کر بھی نہ دیکھا لیکن حضرت ابوبکرؓ بار بار مڑ کر اس کی
حرکات و سکنات کا جائزہ لیتے رہے۔ بالآخر سراقہ نے
امان مانگ کر نزدیک ہونا چاہا تو اس کو امان دی گئی۔
تب اس نے تمام ماجرا دربارہ اعلان قریش اور تعاقب خود
بتلایا اور کہا کہ میں تو حملہ کرنے کی نیت سے آیا تھا لیکن
آپ کا ستارہ بلند ہے اور آپ غالب آئیں گے
اسلئے مجھے امان کی تحریر لکھ دیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کے حکم سے عامر بن فہیرہ نے اس کو امان کی تحریر
لکھ دی۔ جب وہ مڑنے لگا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

روزِ حشر کے موقعہ کو مدِّنظر رکھ کر

(از حضرت سیّدہ نواب مبارکہ بیگم صاحبہ)

{انصار اللہ کے امسال کے سالانہ اجتماع میں مکرم محمد احمد صاحب انور حیدر آبادی نے یہ نظم نہایت خوش الحانی سے سنائی۔ سامعین پر ایک رقت طاری تھی ——— (ایڈیٹر)}

نہ روک راہ میں مولیٰ شتاب جانے دے
کھلا تو ہے تیری جنت کا باب جانے دے

مجھے تو دامنِ رحمت میں ڈھانپ لے یونہی
حساب مجھ سے نہ لے بے حساب جانے دے

سوال مجھ سے نہ کر اے مرے سمیع و بصیر
جواب مانگ نہ اے لاجواب جانے دے

مرے گناہ تیری بخشش سے بڑھ نہیں سکتے
تیرے نثار حساب و کتاب جانے دے

تجھے قسم ہے تیرے ستّار نام کی پیارے
بروئے حشر سوال و جواب جانے دے

بُلا قریب کہ یہ خاک پاک ہو جائے
نہ کر یہاں میری مٹی خراب جانے دے

رفیقِ جان میرے یار وفا شعار مرے
یہ آج پردہ دری کیسی پردہ دار مرے

ضروری اعلانات

اوّل۔ رسالہ الفرقان [illegible] تشحیذ الاذہان کا دفتر گول بازار میں منتقل ہو گیا ہے۔ خریدار احباب وہاں سے رسالہ جات حاصل فرما سکتے ہیں۔

دوم۔ الفرقان کا "خلافت راشدہ نمبر" جو ماہ دسمبر میں شائع ہونے والا تھا بعض وجوہ کے ماتحت وہ آئندہ کبھی شائع ہوگا۔ دسمبر میں بھی وقت پر رسالہ شائع ہوگا۔

سوم۔ رسالہ الفرقان کی تاریخ اشاعت ہر انگریزی ماہ کی پانچ تاریخ ہے۔ سالانہ چندہ پانچ روپے ہے بیرونی ممالک کے لئے بارہ شلنگ ہے۔ جو پیشگی آنا چاہیئے ——— مینجر